مارشل لاء کا سیاسی انداز



ایم، اے، کے چودھری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مارشل لاء کا سیاسی انداز



ایم۔ اے۔ کے۔ چودھری

مارشل لاء کا سیاسی انداز

ایم اے کے چودھری

ترتیب

تعارف

اس کتاب کے مطالعے سے واضح ہے کہ نوجوانوں کے اذہان میں قانون کے احترام کو اجاگر کرنے اور پاکستان میں بارہا قانون کی بالادستی کے مجروح ہونے کے تباہ کن اثرات سے ان کو کما حقہ ' آگاہ کرنے کا جذبہ ہی اس کی تصنیف کا محرک ہے۔ محمود علی خان چودھری پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ وہ انسپکٹر جنرل پولیس ' ڈائریکٹر جنرل وفاقی ادارۂ تحقیق (ایف۔ آئی۔ اے) اور پھر سیکرٹری وزارت داخلہ رہے ' جس عہدے سے وہ جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء لگنے کے چند ماہ بعد ریٹائر ہوئے۔ لٰہذا وہ اپنے علم اور تجربے کی بنا پر بات کرتے ہیں اور ایک محبِ وطن کی حیثیت سے اپنے دل کی گہرائیوں سے بولتے نظر آتے ہیں۔ وہ طبعاً نرم گفتار واقع ہوئے ہیں لیکن راست گوئی اور صداقت ان کے طرز کلام کا خاصہ ہے۔

یہ کتاب ان کی صداقت پسندی اور پختہ عقیدوں کی مظہر ہے۔ حقائق نگاری اور خصوصاً ملک میں متعدد آئینی بحرانوں کے بیان میں ان کی تحریر بے دھڑک اور حق گوئی و بیباکی کی مثال ہے۔ اپنے ناقدانہ انداز میں انہوں نے ریا کے بت توڑے ہیں اور ہر ڈھکوسلے کو بے نقاب کیا ہے۔ انہوں نے دوٹوک کہا ہے کہ جب کوئی آمر کسی آئینی نظام کو تہہ و بالا کرتا ہے تو ہمیشہ یہی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ امن اور تعمیر کے دور کا آغاز کر رہا ہے لیکن یہ امن قبرستان کا سکوت اور یہ تعمیر عوام کی بہبود کے لئے نہیں ' بلکہ ان پر ناجائز دباؤ کا تانا بانا ہوتا ہے۔ آمر اپنے خود ساختہ سیاسی فلسفے کے ساتھ یا اخلاقی اور مذہبی لبادے اوڑھ کر آتے ہیں۔ ان کے لب و لہجے مختلف لیکن مسلک ایک ہی ہوتے ہیں۔ ان کا اولین مقصد عوام کی آزادیٔ افکار سلب کرنا ہوتا ہے۔ سیاسی عمل کو روکنے کے لئے وہ معاشرے کو استبداد کی زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں۔ عدالتیں جو ہر مہذب ملک اور معاشرے میں انصاف اور استحکام کا سرچشمہ ہوتی ہیں ' پابندیوں میں گھٹ کر رہ جاتی ہیں۔

اس ملک میں جمہوریت کا انحطاط اس دور سے شروع ہوا جب گورنر جنرل غلام محمد نے ملک کے منتخب وزیر اعظم کو معزول کر دیا اور آئین ساز اسمبلی کو اس لئے توڑ دیا کہ اس اسمبلی نے گورنر جنرل کے

از خود قانون سازی کے اختیارات کو محدود کر دیا تھا۔ سپریم کورٹ نے گورنر جنرل کے اس فیصلے کی توثیق کر دی۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ آج تک محل نظر ہے۔

لیکن اس مقدمہ "تمیزالدین بنام گورنر جنرل" کے نو دن بعد ہی "یوسف پٹیل بنام سرکار" کیس میں سپریم کورٹ نے فیصلہ کیا کہ آئینی معاملات میں صرف آئین ساز اسمبلی ہی قانون بنا سکتی ہے اور گورنر جنرل کو یہ اختیار تفویض نہیں کیا جاسکتا۔ گورنر جنرل کا اختیار صرف آئین ساز اسمبلی کے بنائے ہوئے قوانین کی توثیق تک محدود تھا اور اس اسمبلی کے توڑ دیئے جانے پر وہ یعنی گورنر جنرل، آئین ساز اسمبلی کا جانشین قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ تمیزالدین بنام گورنر جنرل کیس میں گورنر جنرل کے وکیل مسٹر ڈپلاک نے سپریم کورٹ کو یقین دلایا کہ گورنر جنرل جلد از جلد صوبائی اسمبلیوں کے ذریعے ایک نئی آئین ساز اسمبلی تشکیل دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ گورنر جنرل نے ایکٹ نمبر ۹ مجریہ ۱۹۵۵ء کے ذریعے بعض ایسے قوانین کی توثیق کر دی تھی جو آئین ساز اسمبلی نے گورنر جنرل کو نہیں بھیجے تھے، سپریم کورٹ نے اس ایکٹ کو کالعدم قرار دیتے ہوئے مسٹر ڈپلاک کے بیان کے متعلق گرمجوشی سے کہا:۔

> "ہمارے سامنے جو بیان دیا گیا ہے اس کی رو سے یہ توقع تھی کہ حکومت اپنے مؤقف پر عمل کرتے ہوئے ایک منتخب اسمبلی تشکیل دے گی جو آئین ساز اسمبلی کی حیثیت سے ان تمام قوانین پر غور کرے گی جن کو ایسی اسمبلی کی غیر موجودگی میں توثیق دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئین ساز اسمبلی کا وجود آئینی نظام کا دستور ہے جس سے کہ موجودہ تعطل دور ہو جاتا، لیکن واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ اب حکومت کا ارادہ تبدیل ہو گیا ہے۔ اس آرڈیننس میں کوئی ایسی شق نہیں جس سے ظاہر ہو کہ الیکشن ہونے والے ہیں ماسوائے اس کے کہ ایڈووکیٹ جنرل کا کہنا ہے کہ حکومت ایسا ارادہ رکھتی ہے"

یہی فیصلہ تھا جس کے بعد کہ صوبائی اسمبلیوں کے ذریعے کیئے گئے انتخاب سے ایک آئین ساز اسمبلی معرض وجود میں آئی اور یہی وہ اسمبلی تھی جس نے ۱۹۵۶ء کا آئین مرتب کیا۔ آئین نافذ ہوا تو عوام میں فخر و انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی۔ لیکن یہ خوشی دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ عام انتخابات فروری ۱۹۵۹ء میں ہونے طے پائے۔ عوام ان انتخابات کے ذریعے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ملک میں کاروبار ریاست میں حصہ لینے کے لئے بیتاب تھے۔ تحریک پاکستان کے دور کی طرح ایک بار پھر ملک بھر میں سیاسی عمل کا جوش و خروش تھا۔ خان عبدالقیوم خان کی قیادت میں جہلم سے لے کر گجرات تک ایک ۳۲ میل لمبا جلوس انہی انتخابات کے سلسلے میں نکلا۔ خان عبدالقیوم خان راستے میں جگہ جگہ تقریریں کرتے رہے یہاں تک کہ ان کی آواز بیٹھ گئی۔ خود انہوں نے راقم الحروف کو اسی بیٹھی ہوئی آواز میں بتایا کہ "ملک بھر

میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ رہی ہے اور قوم ایک بار پھر اپنا تشخص قائم کرنے پر آمادہ ہے"۔ گجرات میں ایک عظیم الشان جلسے میں تقریر کرتے ہوئے خان عبدالقیوم خان نے کہا کہ ملک کی فوج عوام میں سے ہے اور وہ عوام کے لئے اپنا فرض پہنچانتی ہے۔ اس بیان سے کراچی میں حکومت لڑکھڑا گئی۔ سکندر مرزا اور ایوب خان نے مل کر آئین کے خلاف بغاوت کی اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا جس کے تباہ کن اثرات نے ملک کی جڑیں ہلا دیں اور آئندہ کے لئے طالع آزما جرنیلوں کے لئے ایک نئی مثال قائم کر دی تاکہ وہ جب بھی کوئی بہانہ پائیں اسی طرح آئین کے خلاف بغاوت کر سکیں۔ یہ حالات کی ستم ظریفی بھی ہے اور ایک المیہ بھی کہ ایک ایسا ملک جو بغیر کسی تشدد کے، جمہوری اصولوں پر صفحہ ہستی پر نمودار ہوا اپنی ہی فوج کے ہاتھوں متعدد بار مارشل لاء کا شکار ہوا۔ فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام کو مخاطب کرتے ہوئے ایک نشریئے میں قائداعظمؒ نے کہا تھا کہ "پاکستان کا آئین جمہوری ہو گا جس میں مساوات، انصاف اور قانون کے اصول کارفرما ہوں گے"۔ انہوں نے افواج پاکستان کو بھی ذہن نشین کرایا کہ ان کے پیشہ کا تقدس کیا ہے، ان کی حلف وفاداری کے مضمرات کیا ہیں اور ملک میں انتظامیہ کے سربراہ کا کیا مقام ہے۔ قرارداد مقاصد جو آئین کے اصولوں پر مشتمل ہے عوام کو خدائے بزرگ و برتر کی عطا کردہ ریاست کے پاسبانوں کی حیثیت سے حکمرانی کے امین گردانتی ہے۔ اس قرارداد میں بنیادی حقوق مساوات، آزادی فکر و عمل، سیاست اور عدلیہ کی مکمل آزادی کی ضمانت ہے۔ متعدد مارشل لاء لگنے سے یہ تمام اصول پس پشت ڈال دیئے گئے اور عوام میں خوف و ہراس پھیلانے کے لئے مارشل ریگولیشنوں کا ایک سیلاب برپا کیا گیا۔ آزادی تحریر و تقریر اور اجتماع سلب کر لی گئی۔ نئے نئے جرائم وضع کر دیئے گئے اور مارشل لاء کورٹ بنا دیئے گئے جن میں کھلی عدالت میں سماعت کے طریق کار کی بجائے بند کمروں میں سماعت ہونے لگی۔ خارجہ پالیسی چند ہاتھوں میں چلی گئی۔ جب ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کے ساتھ جنگ ہوئی تو صدر ایوب کو یہ تاثر دیا گیا کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پار نہیں کرے گا۔ خارجہ پالیسی وضع کرنے والے معدودے چند افراد اسی دھوکے میں رہے اور ہندوستان سرحد پار کر کے پاکستان کی سرزمین میں داخل ہو گیا۔ اگر خارجہ پالیسی پر ایوان میں کھلی بحث ہوتی اور عوام کے نمائندے اس میں باقاعدہ حصہ لیتے تو یہ نوبت کبھی نہ آتی۔ خارجہ پالیسی کا یہ انداز گذشتہ مارشل لاء تک یہی رہا ہے۔ نتیجتاً ہم غیر ملکی قرضہ جات کے بوجھ کے نیچے دبے چلے جا رہے ہیں اور عوامی و سیاسی سوچ کے برعکس امریکہ کی کاسہ لیسی اور غلامی میں جکڑے جا رہے ہیں۔

کتاب میں اس موضوع پر مصنف نے ان الفاظ میں حالات کا جائزہ لیا ہے۔

"The abrogation of the 1956 and the 1962 Constitutions, and the passing of such Acts as the Basic Democracies Act, the Political Parties Act, the very Constitution of 1962, the attempt by Yahya

Khan to write his own Constitution, The Provisional Constitution Order, the Revival of Constitution Order, the amendments to the 1973 Constitution, the referendum and the party-less elections, are all examples of how Martial Law regimes perpetuate themselves by supressing the people and their aspirations. These are, in short, all anti-people measures which appear just and fairto the Juntas because they suit their self interests. However, failure at some stage exposed their hollowness and swept these so-called laws away in the first two cases of Ayub and Yahya. The last Martial Law Chief is still very much in centre of the stage; so the people watch and wait.

ایک دوسری جگہ مصنف کہتا ہے

"The President seems to settle over more comfortably in the saddle, amending the Constitution to such a degree that little of its original spirit remains. The velvet glove is on, but there is little doubt of the iron fist within.

And so, weakened by attacks of Martial Law, Pakistan limps on, with political institutions in tatters, a staggering debt burdens, a suicidal foreign policy and a democracy overshadowed by the army."

اس ملک کا آغاز ایک صحت مند جمہوریت کے ساتھ ہوا تھا۔ ملک برصغیر کے شمال اور مشرق کی حدوں تک پھیلا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے مشرقی پاکستان الگ ہوگیا کیونکہ اس وقت کے آمر نے، جسے سپریم کورٹ نے عاصمہ جیلانی کیس میں اقتدار کا غاصب قرار دیا تھا، سیاسی عمل کو روک دیا۔

گذشتہ مارشل لاء حکام نے بلندوبانگ دعوے کئے تھے کہ وہ نوے دن میں جمہوریت بحال کر دیں گے لیکن وہ تقریباً نو سال تک حکومت پر قابض رہے اور آخر میں ہمیں ایک غیر جماعتی اسمبلی عنایت کی جس کا صدر ایک باوردی فوجی کمانڈر۔ ان۔ چیف ہے۔ اب مارشل لاء تو باقی نہیں لیکن اس کے اثرات اور چھاپ موجود ہیں۔ فوجی عدالتوں میں دی گئی سزائیں بدستور جاری ہیں۔ آرٹیکل A۔ ۲۷۰ آئین میں بلاترمیم موجود ہے اور اس آرٹیکل کے ہوتے ہوئے بنیادی حقوق کی بحالی ایک کھوکھلا دعویٰ لگتا ہے۔ جب تک آرٹیکل A۔ ۲۷۰ آئین میں موجود ہے اور مارشل لاء کے دور میں نافذ کردہ احکام و اعمال کو قانونی تحفظ دیتا ہے، قرارداد مقاصد میں دی گئی آزاد عدلیہ کی ضمانت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ قرارداد مقاصد اب آئین کا باقاعدہ حصہ بن گئی ہے۔ امید ہے کہ وکلاء حضرات اس کے آئینی مضمرات کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں گے۔

جمہوریت کے عالی شان ایوان میں ہم ایک بار پھر طفل مکتب کی طرح داخل ہو رہے ہیں اگر ہمیں انہی پرانی تنومند روایات تک پہنچنا ہے تو مارشل لاء کے طوق کے گلے سے اتار پھینکنا ہوگا۔ ہمیں قانون کی

بالادستی کو صحیح معنوں میں قائم کرنا ہوگا۔ وزیراعظم نے افغانستان کے مسئلے پر گول میز کانفرنس بلا کر ایک جرات مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ سیاسی جماعتوں نے اپنی حب الوطنی کا ثبوت دیتے ہوئے اس دعوت کو قبول کیا وقت آ گیا ہے کہ ہم قرآنی آیت "شوریٰ بینہم" پر وسیع تر انداز میں عمل پیرا ہوں تاکہ سیاسی عمل تعمیر و ترقی کی نئی شاہراہیں کھولے، انسان دوستی پر مبنی انفرادی اور اجتماعی نظام قائم ہو جس میں عوام کی حکمرانی ہو اور انسانی وقار کی تکمیل ہو۔

اب روشنی کی یہ مشعل نوجوان نسل کے حوالے کرنا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ یہ کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہو، نوجوانوں کی حس حب الوطنی کو جلا دے اور جمہوریت کو پاکستان کی تقدیر بنانے پر ان کا ایمان راسخ قائم رہے۔

جسٹس (ریٹائرڈ) شیخ عطاء اللہ سجاد
سابق جج لاہور ہائیکورٹ

تمہید

مجھے آج سے چالیس برس قبل ہی قانون کو بطور پیشہ اختیار کر لینا چاہیئے تھا۔ کیونکہ میں قانون کے تقدّس کی دل و جان سے تعظیم کرتا ہوں اور قانون کی بالادستی کا پرجوش حامی ہوں۔ ہوا یوں کہ ملازمت میرے حصے میں پولیس کے محکمے کی آئی لیکن اس پیشہ میں بھی میں قانون سے منسلک رہا۔گو یہ قانون محض فوجداری ہی تھا۔ بہر کیف ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد میں نے قانون کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور اب بفضلِ تعالیٰ مجھے لاء کالج میں ایک جزوقتی استاد ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

تعلیم کے اس عظیم گہوارے کی کینٹین اور برآمدوں میں مجھے بہت سے طلبأ سے گفتگو کے دوران اس بات کا شدّت سے احساس ہوا کہ ان میں سے بیشتر نوجوانوں کے اذہان مسلسل یک طرفہ پروپیگنڈا اور ذرائع ابلاغ پر کڑے کنٹرول کے باعث مارشل لاء کو ایک اٹل اور ناگزیر مظہر ماننے پر مجبور ہو چکے ہیں اور ان میں سے اکثر عوامی سیاسی عمل کی افادیت کو بھی مشکوک سمجھنے لگے ہیں۔

پروپیگنڈا کی قوت سے ہر شخص بخوبی واقف ہے 'لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے آج تک اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا تھا کہ اس ہنر نے کس چابک دستی سے نوجوان مرد و زن کے ذہنوں کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔واضح ہے کہ اس صورت میں کسی نہ کسی کو تصویر کا دوسرا رخ پیش کرنے کی جسارت کرنی چاہیئے تاکہ وہ دباؤ اور بندش جو قوم کے اس سرمائے کے دلوں میں مارشل لاء نے پیدا کر رکھی ہے ' چھٹ جائے۔ چنانچہ میں نے محسوس کیا کہ وہ حالات و حقائق جن سے میں اپنی مدت ملازمت میں دوچار رہا ہوں ' بیان ہونے چاہیں۔ کہ شاید ان کی روشنی میں ہمارے نوجوان اپنی سوچ کی سمت استوار کر سکیں۔

لہٰذا میں اپنی تمام تر نیک خواہشات کے ساتھ اس کتاب کو پاکستان کے طلباء اور طالبات کے نام موسوم کرتا ہوں۔

ایم۔ اے۔ کے۔ چودھری

پیش لفظ

پاکستان کے واحد منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے آئین کو تشکیل دینے کے سلسلے میں ایک دفعہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ اس ملک میں مارشل لاء کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیں گے یہ وقت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ مارشل لاء ہی کی حکومت نے انہیں پھانسی دی اور دفن کیا۔

یہ پاکستان کا تیسرا مارشل لاء تھا۔ پاکستان کو عالم وجود میں آئے چالیس سال ہوئے ہیں۔ ابتدا میں چھ برس تو بیورو کریسی نے دندنا کر حکومت کی اور بعد میں تقریباً بائیس برس جرنیلوں کی عملداری رہی۔ آخر کیوں؟ کیا پاکستان کی فوج اس بات کی دعویدار ہے کہ وہی حکومت کی اہل اور وارث ہے؟ یا پھر پاکستان کی سیاست اتنی بیمار اور عوام اس قدر بے حس ہو گئے ہیں کہ انہوں نے مارشل لاء کو ایک معمول سمجھ کر تسلیم کر لیا ہے؟

کسی بھی ملک کی حکومت میں شامل انتظامیہ کے پیشہ ور عہدیدار یعنی بیورو کریٹ روز مرّہ کے کاروبار کو چلاتے ہیں۔ سیاست دان ملک کی اہم ضروریات کی نشاندہی کرتے اور عوامی پالیسی کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانا بیورو کریسی کا کام ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ سیاستدان تمام بڑے بڑے فیصلے کرتے ہیں اور ان کی ہدایات کے مطابق بیورو کریسی ان پر عمل در آمد کرتی ہے۔ دونوں کا دائرہ کار الگ الگ ہے اور کسی ایک کا دوسرے کی عملداری میں مخل ہونا باعث خرابی ہوتا ہے۔ خصوصاً بیورو کریٹ خواہ کتنا ہی مختلف نظریہ رکھتا ہو، جب تک وہ ملازمت میں ہے 'اسے بر سر اقتدار پارٹی کے منشور اور وضع کردہ پالیسی کی اطاعت لازمی ہے اور یہ بھی لازم ہے کہ بیورو کریسی اپنے آپ کو مکمل طور پر سیاست سے الگ رکھے کیونکہ سیاست اس کا میدان نہیں۔

لیکن نو آبادیاتی طرز حکومت میں معاملہ خاصہ مختلف ہوتا ہے۔ بڑے پرکار اہتمام سے بیورو کریسی کو خالص نو آبادیاتی قسم کی تربیت دی جاتی ہے، حتیٰ کہ افسر لوگ اپنے آپ کو اپنے ہی عوام سے الگ، بہتر، اعلیٰ مقام اور مختلف النوع سمجھنے لگتے ہیں۔ یوں صاحب بہادری کا ملمع چڑھا کر ان کے لئے علیحدہ رہائشی کالونیاں اور وسیع سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں جو عام آدمی کی رسائی سے بہت بالا ہوتی ہیں۔ نتیجتاً وہ عوام کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی نہایت بے ضرر سیاسی کاوش کو بھی ہنگامہ آرائی اور سرکار دولت

مدار کے خلاف بغاوت کا نام دیتے ہیں۔ نو آبادیاتی آقاؤں کی سرپرستی میں ان کے لئے قانون اور آئین میں تحفظات موجود ہوتے ہیں، لہٰذا ان کو عوام کے سامنے کسی جواب دہی کا خوف نہیں ہوتا۔ اس نظام میں نو آبادیاتی طاقت بیوروکریسی پر مکمل اعتماد اور انحصار کرتی ہے اور انہی سے براہ راست تعلق رکھتی ہے۔ اس کے برعکس سیاستدان کو برائے نام اقتدار میں لا کر بھی انتظامیہ کے بست و کشاد سے لاتعلق رکھتی ہے۔ ایکٹ ۱۹۱۹ء کی بدنام دوعملی حکومت اس امر کی منہ بولتی مثال تھی۔

تاہم آزادی کے بعد یہ توقع تھی کہ بیوروکریسی اپنے احساس برتری کو ترک کر کے عوام کی خدمت کی طرف مائل ہوگی جو اس کا صحیح مقام ہے۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ بیوروکریسی نے ابھی تک اپنی نو آبادیاتی ڈگر کو نہیں چھوڑا اور سیاسی حکمرانوں کے پاؤں نہیں جمنے دیئے۔ ملک میں کمزور سیاسی بنیادوں کا فائدہ اٹھا کر وہ کسی نہ کسی صورت اقتدار میں شریک رہی ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس نے ملک میں سیاسی عمل کو پنپنے ہی نہیں دیا۔ اگر کبھی حالات نے سیاست کو موقع دیا تو بیوروکریسی نے از خود یا کسی بیرونی طاقت کی مدد سے سیاستدانوں کا تختہ الٹ دیا اور اقتدار کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس محلاتی سازش میں سول اور فوجی بیوروکریٹ دونوں شامل رہتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم مارشل لاء کی بحث اور پاکستان کی سیاست پر اس کے اثرات کے بارے میں کچھ کہیں مناسب ہوگا کہ ہم لفظ مارشل لاء کے معنوں کی مفصل تعریف کر لیں۔ یہاں میں مشہور مقدمہ عاصمہ جیلانی بنام سرکار میں سپریم کورٹ کے فیصلے سے اقتباس دینا چاہوں گا۔ جو حسب ذیل ہے۔

مارشل لاء تین قسم کا ہوتا ہے۔

(۱) وہ قانون جو مسلح افواج کے نظم و ضبط اور دیگر معاملات کے تصفیہ کے لئے لاگو ہو۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں

(۲) وہ قانون جو فاتح فوج کسی غیر ملک پر قبضہ کرنے کے بعد نافذ کرے۔ اس قسم کے مارشل لاء کی کلاز کی تعریف ڈیوک آف ویلنگٹن نے ہاؤس آف لارڈز میں ان الفاظ میں کی "مارشل لاء صرف اور صرف فاتح جرنیل کی مرضی ہوتی ہے جس کے تحت وہ مفتوحہ علاقے پر کمانڈ کرتا ہے۔ دراصل مارشل لاء کا سیدھا سادا مطلب ہے لاقانونیت۔"

اس قسم کے مارشل لاء سے بھی ہمارا کوئی تعلق نہیں۔

(۳) وہ قانون، جب سول حکومت امن عامہ برقرار رکھنے میں عہدہ برآنہ ہو کر فوج کو حالات پر قابو پانے اور امن عامہ کو بحال کرنے کے لئے بلائے اور مارشل لاء نافذ ہو۔ ایسی صورت میں مارشل لاء کے تمام ضابطے اور احکام محض امن بحال کرنے کے متعلق ہوتے ہیں اور امن بحال کر کے سول حکومت کو اقتدار لوٹانا مقصد ہوتا ہے۔

عملی طور پر یحییٰ خان کا مارشل لاء دوسری قسم کا تھا۔ اس نے ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء سے لے کر ۲۰ مارچ ۱۹۷۱ء تک بڑی تعداد میں مارشل لاء کے ضابطے اور آرڈر جاری کیے جن کا سول ہنگاموں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دراصل مارشل لاء لگنے کے چند روز بعد ہی ملک میں امن عامہ بحال ہو گیا تھا۔ لہٰذا مارشل لاء کو اسی وقت ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن حکومت کے تمام اداروں کو جن میں عدالتیں بھی شامل تھیں، یحییٰ خان کے سامنے حاضر ہونا پڑا جیسے کوئی فوجی کمانڈر کسی غیر ملک کو فتح کر کے مغلوب رعایا کو حاضر ہونے کا حکم دیتا ہے۔ پاکستان نہ تو کوئی مفتوحہ ملک تھا اور نہ ہی یحییٰ خان کی کمانڈ میں فوج کوئی غیر ملکی فاتح لشکر تھا جو اس قسم کا مارشل لاء نافذ کرنے کا مجاز ہوتا۔

"لہٰذا یحییٰ خان کا نافذ کردہ مارشل لاء غیر قانونی تھا اور اس کے جاری کردہ تمام ضابطے اور احکام بھی غیر قانونی اور کالعدم تھے۔"

جب مارشل لاء قانون کی بالادستی کی نفی کرتا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک نوزائیدہ ملک جو اتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئیں اسے کیوں تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ کیا مارشل لاء کا اتنی آزادی سے یوں بار بار لگنا مناسب اقدام تھے؟ ایس۔ ای۔ فائز نے اپنی مشہور کتاب THE MAN ON HORSE BACK میں لکھا ہے کہ

"مسلح افواج کو سول تنظیموں پر تین طرح کی برتری حاصل ہے۔ اولاً اعلیٰ اور نمایاں تنظیم، ثانیاً ایک ولولہ انگیز جذبہ اور ثالثاً اسلحہ کی فراوانی۔ جنگ و جدل ان کا پیشہ ہے اور وہ اپنی طاقت کے نشے میں سرمست رہتے ہیں۔ اس لئے حیرت اس بات پر نہیں کہ وہ اپنے سول آقاؤں کے خلاف بغاوت کیوں کرتے ہیں۔ بلکہ حیرت یہ ہے کہ وہ سرے سے سول آقاؤں کو تسلیم ہی کیوں کرتے ہیں۔

خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فائز نے ان محرکات کا ذکر کیا ہے جو فوجوں کو مارشل لاء نافذ کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

"فوج کی سیاسی سوجھ بوجھ کی کمی، فوجی مداخلت کا اخلاقی فقدان اور پھر سب سے اہم عوام کی قوت مدافعت یا کم از کم مدافعت کا جذبہ۔ پاکستان کے تجربے میں آخری شق یعنی عوام میں مدافعت کی کمی یا کمزوری ہی فوج کو بار بار مارشل لاء نافذ کرنے کی دعوت کے مترادف رہی ہے۔

ہندوستان میں حالات و واقعات ہمارے ہاں سے بہت مختلف ہیں۔ مشرقی پنجاب میں جب سکھوں نے علیحدہ اور خود مختار ریاست کے مطالبے کے سلسلے میں بغاوت کا علم بلند کیا تو مرکزی حکومت نے پنجاب کی صوبائی حکومت کو امن قائم نہ رکھ سکنے کی بنا پر معزول کر دیا اور گورنر راج نافذ ہوا۔

وفاقی ریزرو پولیس بلائی گئی اور ساتھ ہی ساتھ گفت و شنید کا سلسلہ بھی جاری رکھا گیا۔ جب ان سب اقدام میں ناکامی ہوئی تو فوج کو سول انتظامیہ کی مدد کے لئے بلایا گیا۔ ادھر سکھوں نے ہندوؤں کا قتل عام شروع کر دیا اور انتظامیہ کو بے بس کر دیا۔ آخر کار فوج نے سکھوں کے مقدس گردوارہ گولڈن ٹیمپل جہاں سے تمام تخریب کاری کی سرپرستی ہوتی تھی' پر حملہ کیا۔ دونوں طرف سے جدید اور بھاری اسلحہ استعمال کیا گیا اور سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ شہر بھر میں ہیجان' بدامنی' لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ چنانچہ شہر کو بھی وقتی طور پر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ قتل و غارت دونوں طرف سے جاری رہا یہاں تک کہ سکھوں نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کو بھی ہلاک کر دیا۔

جس وقت امرتسر کے حالات بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔ وزیر اعظم کے ایک مشیر نے مقامی طور پر مارشل لاء نافذ کرنے کا مشورہ دیا لیکن اندرا گاندھی نے 'سیخ پا ہو کر اسے ردّ کر دیا۔ جہاں تک بھارتی فوج کا تعلق ہے' کسی جرنیل کی جرأت تک نہیں ہوئی کہ مارشل لاء لگائے یا اس کی تجویز تک کرے۔

پاکستان میں عوام مارشل لاء کو اتنی آسانی سے کیوں قبول کر لیتے ہیں اور اپنے حکمرانوں کو خود منتخب کرنے کے عمل سے کس لئے پسپا ہو جاتے ہیں؟ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ پاکستانی عوام سیاسی عمل' نمائندہ حکومت اور قانون کی بالادستی کے اتنے ہی حامی ہیں جتنے کسی بھی اور ملک کے باشندے۔ وہ محض سفاک قوّت سے مغلوب ہو جاتے ہیں' جس قوّت کا استعمال مارشل لاء نافذ کرنے والے جرنیل کر سکتے ہیں یا کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ قوّت کے بارے میں برٹرینڈ رسل لکھتا ہے۔

"جب طاقت ننگی ہو کر سامنے آجائے تو پھر جائے وقوعہ ملکی ہو یا بین الاقوامی'
ایسی طاقت کا استعمال زیادہ سنگدلانہ اور سفاکانہ ہو جاتا ہے۔"

بنیادی حقوق سے محرومی' جلاوطنی' قید و بند' کوڑے مارنا' سرعام پھانسیاں دینا' عدالتوں کے اختیارات کی سلبی' انتظامیہ پر مکمل کنٹرول' کرفیو' ہر قسم کی سیاسی سرگرمی کی معطلی' یہ سب وہ ظالمانہ اقدامات ہیں جنھوں نے سال ہا سال میں عوام کی قوّت مدافعت کو کمزور کرتے کرتے ختم کر دیا ہے اور عوام مارشل لاء کے مقابل بے بس ہو کر رہ گئے ہیں

اس کے بعد کے ابواب میں قومی پالیسیوں کی کمزوری' پاکستان میں مارشل لاء دور کے تحت مختلف لیڈر شپ اور اس کے سیاسی ماحصل کا ذکر اور تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

امریکن رابطہ

دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سیاسی میدان میں، جو ہمارا موضوع سخن ہے، نو آبادیاتی نظام کی بساط الٹنا شروع ہو گئی، امن کی تلاش میں اقوام متحدہ کا ظہور ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اشتراکی اور سرمایہ داری نظام کے داعی کھل کر مدِمقابل بن گئے۔ علاوہ ازیں ایک اور تاریخی وقوعہ جو ظہور پذیر ہوا وہ تھا امریکہ کا خود ساختہ علیحدگی کے خول سے نکل کر بین الاقوامی سیاست میں قدم رکھنا اور پھر جنگ عظیم کی صعوبتوں سے واماندہ مغرب کی لیڈر شپ سنبھالنا۔

آہستہ آہستہ ایک تیسری دنیا بھی ابھری ان پس ماندہ ممالک پر مشتمل جن کو نئی آزادی ملتی گئی۔ بظاہر اس تیسری دنیا کا دونوں بڑے بلاکوں سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے تھا لیکن اپنی پس ماندگی اور ضروریات زندگی کی فراہمی کی خاطر ان کا کسی نہ کسی بلاک کے زیر اثر آ جانا ناگزیر ہو تا گیا۔ ادھر دونوں بلاکوں کے درمیان جو سرد جنگ شروع ہو چکی تھی اور جاری ہے اس کے پیش نظر ہر بلاک تیسری دنیا کے ممالک میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے بے قرار ہے۔ جو ملک ان دونوں کے اثر سے آزاد رہنے کی جرأت رکھتا ہو اس پر ہر طرح سے ڈورے ڈالے جاتے ہیں ورنہ کمزور، زیادہ پس ماندہ ممالک کو ڈرا دھمکا کر زیر کرتے ہیں۔ اس سرد جنگ میں ماہر جاسوسی اداروں کا دائرہ کار محض خبریں حاصل کرنے سے نکل کر سیاسی قتل، تخریب کاری، حکومتوں کا تختہ الٹنے تک وسیع ہو گیا ہے۔ بدنام زمانہ امریکن سی۔ آئی۔ اے اور روسی کے۔ جی۔ بی۔ کے کارنامے اس ضمن میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہے۔ ہنگری میں امرے ناگی اور جنوبی ویت نام میں ڈی۔ ایم۔ کے قتل، ایران، گوئٹے مالا، کیوبا، ہنگری، نیکاراگوا اور درجنوں دوسرے ممالک میں تخریب کاری اور حکومتوں کے ادل بدل کی ذمہ داری اب یہ ایجنسیاں فخر سے قبول کرتی ہیں۔

ابتدائی سال

موضوع بحث چونکہ پاکستان اور اس کے موجودہ حالات ہیں' مناسب ہو گا کہ ہم تاریخ کے دور دراز ادوار کو چھوڑ کر آزادی کے سال یعنی ۱۹۴۷ء اور اس کے قریب کے واقعات پر نظر ڈالیں۔ تاریخی اعتبار سے تو ہم مغربی سرمایہ داری نظام کی صف بندی میں شامل ہیں۔ البتہ جب سے برطانیہ کی عظمت کا زوال ہوا ہے' اب مغربی ممالک میں امریکہ ہمارے نئے محسن کے روپ میں ابھرا ہے۔ لہٰذا پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ ہی اس باب کا موضوع ہے۔

سر اولف کیئرو نے ۱۹۴۰ء میں ریکارڈ کیا تھا کہ

> "۱۹۳۲ء میں جب امریکہ نے بحرین کے ساحلی جزیرے مانامہ میں تیل دریافت کیا تو اس علاقے سے امریکہ کا تعلق پہلی بار قائم ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز اس علاقے میں ایک صدی سے اثر انداز تھے اور ہندوستان اور اس کے نواح پر پورا تسلط رکھتے تھے۔ اس کے باوجود دونوں ملکوں کو' یعنی انگریزوں اور امریکہ کو اس وقت بھی روس کا سایہ ایسے ہی ڈرا رہا تھا جیسا کہ اب' اس وقت سے انہیں پیہم خطرہ لاحق ہے کہ روس مشرق وسطیٰ کا تیل ان سے چھین کر لے جائے گا۔
>
> لہٰذا امریکہ کی دلچسپی اس علاقے میں تیل کے ذخائر کی نت نئی دریافت اور اپنی بڑھتی ہوئی ضروریات کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس ضرورت کا پورا کرنا ہی کافی نہیں یہ بھی ضروری ہے کہ امریکہ یہاں اپنی اجارہ داری برقرار رکھے اور روس کو ہر قیمت پر یہاں پاؤں جمانے سے باز رکھے۔

پاکستان ایک عظیم کرب کی حالت میں عالم وجود میں آیا اور ابھی اس نے سانس لینا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ ہر نوع کی مشکلات کے پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑے! اول تو ہندوستان میں ہندوؤں نے پاکستان کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کیا! ستم بر ستم کہ انہوں نے ایسے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیئے کہ یہ ملک کسی نہ کسی صورت ختم ہو جائے۔ تقسیم کے بعد وہ تمام اثاثہ جات جو پاکستان کے حصے میں آئے تھے روک لئے گئے۔ ہر قسم کا ساز و سامان' سرمایہ اور فوجی اسلحہ وغیرہ نہ دیا گیا اور جو کچھ اور جب دیا وہ اکثر و بیشتر ناکارہ تھا۔ مزید بر آں جموں اور کشمیر کی ریاستوں پر بالجبر قبضہ کر لیا جب کہ اصولی طور ان دونوں ریاستوں کا الحاق پاکستان کے ساتھ ہوا طے شدہ امر تھا۔ جب پاکستان کشمیر کے معاملے کو اقوام متحدہ میں لے گیا تو ہندوستان نے کشمیر کے عوام کو استصواب رائے کا حق دینے کا سنجیدہ وعدہ کیا لیکن وہ دن اور آج کا دن یہ وعدہ وفا نہیں ہوا۔ باوجود چالیس برس کے مخالفانہ قبضے کے آج بھی ہندوستانی حکومت کو یہی خطرہ لاحق ہے کہ رائے شماری کبھی ان کے حق میں نہیں ہو سکتی۔



نوابزادہ لیاقت علی خان

آج بھی کشمیر کا مسئلہ دونوں ملکوں کے درمیان بنائے مخاصمت ہے جس کی وجہ سے باقاعدہ جنگیں ہو چکی ہیں۔ پاکستان اندرونی خلفشار کا شکار ہونے کے باعث ۱۹۷۱ء کی جنگ میں آدھا ملک بھی کھو بیٹھا ہے۔ بایں ہمہ دونوں ملکوں میں فوجی قوت بڑھانے اور اسلحہ اندوزی کی دوڑ جاری ہے۔

۵۱-۱۹۵۰ء کے سال پاکستان پر خاص طور پر بھاری تھے کیونکہ اس زمانے میں ہندوستان نے اپنی بیشتر فوج پاکستان کی سرحد پر جمع کر دی تھی۔ تاہم خوش قسمتی سے بات محض دھمکی تک ہی محدود رہی اور یہ نازک صورت حالات کسی طور گزر ہی گئے۔ پاکستان کا دفاع اس مرحلے پر نہ ہونے کے برابر تھا۔ جنرل ایوب خان جو بعد میں پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف اور پھر اور بہت کچھ بنے' اپنی اس وقت کی رپورٹ میں کہتے ہیں کہ

"پاکستان کے پاس صرف تیرہ ٹینک تھے جن کے انجنوں کی زندگی بصد مشکل چالیس یا پچاس گھنٹے کی باقی تھی اور توپ خانے کے پاس گولہ بارود نہ ہونے کے برابر تھا۔"

ان حالات میں پاکستان کو ایک ایسے حلیف کی تلاش تھی جو ہندوستان کے حملے کی صورت میں اس کی مدد کر سکے۔ اسلامی ممالک کی طرف سے کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ کامن ویلتھ کے ممالک میں سے کسی کو ہمارے ساتھ دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی ان میں سے کوئی ہندوستان سے تعلقات خراب کرنے کے لئے تیار تھا۔ چین اور روس میں سے بھی کوئی ہماری مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور سچ تو یہ ہے کہ خود ہم نے بھی سنجیدگی کے ساتھ ان کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ لہٰذا پاکستان کی قیادت نے امریکہ سے رسائی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ امریکہ نے ابتدائی مراحل میں جنگ کے فاضل اسلحہ میں سے پاکستان کو ایک کروڑ ڈالر کے فوجی ساز و سامان خریدنے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن پاکستان ایک مضبوط اور قابل اعتماد دوست کی تلاش میں تھا۔ چنانچہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے روس کے دورے کی دعوت کو نظر انداز کر کے امریکہ کا دورہ کیا۔ واشنگٹن میں نیشنل پریس کو خطاب کرتے ہوئے۔ انہوں نے کہا۔

"ایک ایسی دنیا میں جہاں نظریاتی تضاد ہو' تو آزاد ممالک ذہنی انتشار کے شکار اور غیر مستحکم ہو سکتے ہیں۔ ان حالات میں کیا یہ بات انتہائی اطمینان بخش نہیں کہ ایسے ملکوں میں کم از کم ایک ملک ایسا ہے جو کسی تذبذب میں نہیں اور جو اپنی روایات اور عقیدہ میں جمہوریت اور معاشی انصاف کے اٹل اصولوں پر ڈٹ کر کاربند ہے۔"

اسی تقریر میں لیاقت علی خان نے امریکی اور پاکستانی اداروں میں یکسانیت تلاش کرتے ہوئے سرمایہ داری نظام کی حمایت کی اور امریکیوں کو پاکستان میں سرمایہ کاری کی کھلی دعوت دی۔"

پاکستان کے دفاع کے سلسلے میں انہوں کہا۔

"ہم جانتے ہیں کہ امریکہ ہر قسم کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف ہے۔
اس نیک ارادے میں آپ پاکستان کو اپنا ہم رکاب پائیں گے۔"

جارحیت کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے محتاط انداز سے یہ بھی کہہ ڈالا کہ

جارحیت جارحیت ہی ہے خواہ وہ کمیونسٹ اطراف سے ہو یا کسی اور طرف سے اور
اس میں امتیاز کرنا امریکہ جیسے بااصول ملک کو زیب نہیں دیتا"

اس تمام تر کاوش کے باوجود امریکہ کا رویہ سرد مہری کا ہی رہا تا کہ وہ پاکستان کی خاطر ہندوستان سے دشمنی مول نہ لے۔ دراصل امریکہ اس زمانے میں بھرپور کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ہندوستان کو اشتراکی بلاک کے زیر اثر آنے سے روکے اور خود اپنے حلقہ بگوشوں کی صف میں لے آئے۔ تاہم جب ۱۹۵۱ء میں ہندوستان نے کوریا کی جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو امریکہ پر یہ واضح ہو گیا کہ ہندوستان ان کے زیر دام آنے والا نہیں۔ یہ وہی زمانہ تھا جب مصدق نے بطور وزیر اعظم ایران تیل کے تمام ذخائر کو قومی تحویل میں لے لیا تھا۔ ادھر پاکستان نے امریکہ کی کوریا پالیسی کی دل کھول کر تائید کی۔ چنانچہ ہندوستان اور ایران کے حالات کے پیش نظر امریکہ نے پہلی بار پاکستان کو در خود اعتنا سمجھا اور اس طرح اچانک ہی پاکستان اور امریکہ کے درمیان تعلقات کی پہلی پیش رفت ہوئی۔

"گورنر جنرل غلام محمد اور جنرل ایوب خان پہلے ہی سے امریکہ کے حامی اور اتحادی تھے۔ امریکہ کے اشارے پر خواجہ ناظم الدین جیسے ثقہ بند سیاست دان کو وزیر اعظم کے عہدے سے ہٹا کر امریکہ میں مقیم پاکستانی سفیر محمد علی بوگرہ کو پاکستان کا وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ یہ اقدام بھی ایک ماہر شاطرانہ چال بازی سے ہوا۔ ملک بھر کے ذرائع ابلاغ سے یہ کہلوایا گیا کہ گندم کی فصل کی ناکامی کے باعث قحط پڑنے والا ہے۔ اس قحط کا ذمہ دار وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو ٹھہرایا گیا اور ۱۹۵۳ء میں خواجہ صاحب کو وزیر اعظم کے عہدے سے الگ کر دیا گیا۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر امریکہ نے بڑی فراخ دلی سے پاکستان کو قحط سے بچانے کے لئے گندم دینے کا اعلان کر دیا۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن امریکی گندم پورے ایک سال کے بعد پہنچی جب کہ خود پاکستان میں گندم کی بھرپور فصل پیدا ہو چکی تھی۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جس قحط کے الزام پر خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا گیا تھا ملک میں اس کا نام ونشان تک نہ تھا۔
اس طرح امریکہ اور پاکستان میں امریکہ کے حواریوں کا پول کھل گیا۔

خواجہ ناظم الدین کی برطرفی نہ صرف مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک دراڑ کی صورت اختیار کر گئی بلکہ مستقبل میں سول حکومت کے لئے خطرے کا ایک واضح اشارہ بھی ثابت ہوئی۔

ایوب خان کا دور

ناظم الدین جیسے زیرک سیاست دان کو راستے سے ہٹانے کے ساتھ ہی معاملہ آسان ہو گیا۔ ۵۴۔ ۱۹۵۳ء میں ایوب خان نے امریکہ کا دورہ کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد اور وزیر اعظم محمد علی بوگرہ بھی ہمراہ تھے۔ اس دورے کا خاص کارنامہ یہ تھا کہ پاکستان نے امریکہ کو اپنی سرزمین پر ہوائی اڈے بنانے کی اجازت دے دی۔ تا کہ امریکہ اشتراکی حملے کی صورت میں دفاع کر سکے۔ اس دورے کے اختتام پر امریکہ کے نائب صدر نکسن اور سیکرٹری آف سٹیٹ جان فاسٹر ڈلس پاکستان آئے اور پاکستان اور امریکہ کے درمیان باہمی دفاعی معاہدہ طے پایا۔ ستمبر ۱۹۵۴ء میں پاکستان ساوتھ ایسٹ ایشیا ٹریٹی آرگنائزیشن SEATO میں شامل ہوا اور اس سے اگلے سال سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن CENTO کا رکن بنا جس کا نام ابتدا میں بغداد پیکٹ رکھا گیا تھا۔ ان ہر دو معاہدوں کا مقصد روس اور چین کے خلاف دفاع کرنا تھا یا یوں کہیئے کہ ان ملکوں کے دائرہ اثر کو محدود رکھنا تھا تا کہ ان کا نظریاتی موقف بھی ممبر ممالک میں نشر نہ ہو سکے۔

> ۱۹۵۸ء میں جب امریکہ نواز جنرل محمد ایوب خان نے پاکستان میں حکومت کا تختہ الٹ کر خود اقتدار پر قبضہ کر لیا تو اس نے امریکہ کے ساتھ ایک مزید معاہدہ کیا جس میں پاکستان کو MOST ALLIED OF THE ALLIES لکھا گیا۔

یعنی بقول ن۔ م۔ راشد دریوزہ گر اعظم کا لقب پاکستان کے نام کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا اور اس طرح پاکستان پکے ہوئے بیر کی طرح امریکہ کی جھولی میں گر گیا۔ اشتراکی بلاک کی طرف کے تمام کھڑکیاں دروازے بند کر دیئے گئے کہ اس طرف سے کوئی ہوا کا جھونکا بھی نہ آنے پائے۔ اس پالیسی کے برعکس ہندوستان غیر جانبدار رہ کر دونوں بلاکوں سے تعلقات استوار رکھتا اور دونوں سے فائدے حاصل کرتا رہا اور آج بھی کرتا ہے۔

پچاس کے عشرے میں جب کہ پاک امریکی تعلقات تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ روس نے پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اگست ۱۹۵۶ء میں جناب ایم۔ اے۔ کھوڑو صاحب کی قیادت میں ایک وفد روس گیا اور واضح طور پر یہ تاثر لے کر لوٹا کہ دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات بہتر ہونے کی صورت میں روس کشمیر کے تنازعہ میں اپنا مؤقف تبدیل کر لے گا اور سابقہ ہندوستان نواز پالیسی ترک کر دے گا۔ کشمیر کے تنازعے کے حل کے لئے یہ ایک بہت اہم اور سنہری موقع تھا۔ کیونکہ جب کبھی اقوام متحدہ



خواجہ ناظم الدین

کی سیکورٹی کونسل میں یہ مسئلہ اٹھایا جاتا تھا، روس اس کو ہمارے خلاف VETO کر دیا کرتا تھا۔ لیکن افسوس کہ ہم نے امریکہ کی قربت کے نشے میں یہ موقع دانستہ طور پر کھو دیا۔

۱۹۵۸ء میں حکومت کا تختہ الٹنا

بعض وجوہات کی بنا پر ۱۹۵۸ء کے لگ بھگ پاک امریکہ تعلقات میں قدرے سرد مہری آ گئی۔ پاکستان میں عوام کو SEATO اور CENTO جیسے معاہدوں میں شمولیت کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتی تھی اور نہ ایک بلاک کی طرف اس قدر جھکاؤ، جس نے ہمیں کاسہ لیسی کا درجہ دے رکھا تھا۔

ادھر ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا پہلا آئین بن چکا تھا۔ جس کے تحت سکندر مرزا گورنر جنرل کی بجائے صدر پاکستان بن گئے تھے۔ بیورو کریسی اور فوج کی مکمل حمایت سکندر مرزا کو حاصل تھی۔ لیکن اس جمود میں ایک انقلاب الیکشن کی صورت میں نمودار ہونے والا تھا' یا ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پورے ملک میں جمہوری تحریک چل نکلی۔ عوام بیورو کریسی کی حکمرانی سے بیزار ہو چکے تھے اور نمائندہ حکومت کی آمد' آمد پر شاداں و فرحاں تھے۔ سکندر مرزا کی مخالفت عام تھی۔ ایوب خان کا ملازمت کی مدت پوری کرنے کے باوجود بار بار توسیع ملازمت کا بندوبست کر لینا بھی عوام کی نظروں میں کھٹکتا تھا۔

> پچاس کی دہائی میں امریکہ نے قرائن سے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ پاکستان میں فوج اقتدار پر قبضہ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے اور یہ واقعہ جلد ہی رونما ہونے والا تھا۔

بعد کے آنے والے حالات کے مطابق خود ایوب خان کے بھائی سردار بہادر خان کا کہنا تھا کہ اس فوجی پلان میں امریکہ کی سی۔ آئی۔ اے کا بھی ہاتھ تھا۔ چنانچہ الیکشن اور اس کے نتائج کے خوف سے سکندر مرزا صدر اور ایوب خان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن گئے۔ مارشل لاء لگنے کے چار روز کے اندر اندر امریکی ڈیفنس سیکرٹری پاکستان میں وارد ہوئے اور باہم مشورے ہوئے۔ جلد ہی ایوب خان نے سکندر مرزا کو معزول کر کے صدر کا عہدہ بھی اختیار کر لیا اور از راہ مروّت سکندر مرزا کو ملک چھوڑنے کی اجازت دے دی۔ اس طرح ملک میں سیاسی عمل کو معطل کر کے فوج کے سربراہ نے ایک ایسی روایت کی بنا ڈال دی جس نے بعد میں وطن عزیز کو دو نیم کر کے رکھ دیا' بنیادی قوانین اور اداروں کی جڑیں ہلا دیں اور قوم اور قومیت کے تصور کو پارہ پارہ کر دیا۔

بہر طور ایوب خان کے برسر اقتدار آتے ہی امریکہ نواز پالیسیوں کا دور شروع ہو گیا۔ فارن آفیئرز جرنل میں ایک مضمون میں ایوب کی تحریر تھی۔

> "پاکستان نے واضح طور پر مغرب کے ساتھ اپنی شناخت کا اعلان کر دیا ہے اور بعض دوسرے ملکوں کی پالیسی سے ہٹ کر ہم نے کمیونسٹ ممالک سے مکمل علیحدگی اور ان سے ہر قسم کی مدد سے دست برداری اختیار کر لی ہے۔ ہم کسی دوغلے پن کی حکمت عملی پر یقین نہیں رکھتے۔"

۱۹۶۱ء میں امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے ایوب خان نے پر جوش لہجے میں کہا

"برّ اعظم ایشیا میں پاکستان واحد ملک ہے جس کی سرزمین پر امریکی فوجیں "آزاد دنیا" (مراد سامراجی یا سرمایہ داری بلاک) کے دفاع کی خاطر قیام پذیر ہو سکتی ہیں۔"

۱۹۵۹ء میں جب کہ ایوب کو اقتدار سنبھالے مشکل سے چند ماہ ہوئے تھے، پشاور کے قریب بڈابیر میں امریکہ کو ایک خفیہ اڈہ بنانے کی اجازت دی گئی۔ یہ معاہدہ خفیہ رکھا گیا اور پاکستانیوں کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہوئی۔ یہ ہوائی اڈہ دراصل سی۔ آئی۔ اے کا اڈہ تھا۔ جہاں سے خاص قسم کے اونچی اڑان کے ہوائی جہاز یو۔ ۲ روس کی سرزمین کے اوپر پرواز کرتے اور روسی مواصلاتی نظام اور دیگر فوجی اداروں کی جاسوسی کرتے تھے۔ امریکہ نے ایوب خان کو یقین دہانی کرا رکھی تھی کہ یو۔ ۲ طیارے کی پرواز اتنی بلندی پر ہوتی ہے کہ کوئی روسی طیارہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ لہٰذا یو۔ ۲ روسی ہوابازوں کی دسترس سے باہر اور ناقابل تسخیر ہے۔ اس دعوے کا پول اس وقت کھل گیا۔ جب روسیوں نے یو۔ ۲ طیارہ گرا لیا اور اس کے پائلٹ گیری پاورز کو زندہ حراست میں لے لیا۔ گیری پاورز نے تفتیش کے دوران تمام حالات من و عن بیان کر دیئے اور پاکستان کے اس معاملے میں ملوّث ہونے کا راز بھی افشا ہو گیا۔

"روس نے پاکستان کو سخت تنبیہ کی اور کہا کہ ہم نے اپنے نقشوں میں پشاور کے گرد سرخ دائرہ لگا لیا ہے تاکہ وقت پڑنے پر اس شہر کو نشانہ بنایا جا سکے۔ نیز یہ بھی کہا کہ آئندہ اگر پاکستان کی سرزمین سے کوئی امریکی طیارہ روس میں داخل ہوا تو پاکستان کو اس جرم کی قرار واقعی سزا برداشت کرنا ہوگی۔"

اس واقعہ کے بعد یو۔ ۲ کی پروازیں تو بند ہو گئیں۔ لیکن بڈابیر کا اڈہ بدستور امریکی جاسوسوں کا مرکز بنا رہا۔

امریکی سی۔ آئی۔ اے نے ایوب خان پر دباؤ ڈال کر کراچی میں بھی جاسوسی کا ایک خاص ادارہ کھول دیا۔ بظاہر یہ ادارہ پاکستان کے انٹیلی جنس بیورو کا حصہ کہلاتا تھا، لیکن دراصل یہ صرف پاکستانی سٹاف کو استعمال کرتا تھا اور اس کا تمام کاروبار امریکی افسر ہی چلاتے تھے۔ پاکستانی حکام کو اس ادارہ کی تہ کوئی رپورٹ دی جاتی تھی اور نہ ہی کسی کو اس کے کاروبار میں دخل دینے کا اختیار تھا۔ یہ ادارہ تمام اشتراکی ممالک کے سفارت خانوں کے خلاف جاسوسی کرتا تھا۔ اس کی تیز رفتار گاڑیاں جن پر پاکستانی نمبر پلیٹ ہوتی تھیں اور پاکستانی ڈرائیور سفارت کاروں کا پیچھا کرتے تھے اور وہ بھی کچھ اس انداز سے کہ جن کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ ان کو اس بات کا علم بھی ہو۔ ان سفارت خانوں کے ٹیلیفون بھی ٹیپ کیئے جاتے تھے۔ اس سب عمل سے دو مقصد حل ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ اشتراکی سفارت کاروں کی آمد و رفت اور گفت و شنید سے ان کی سرگرمیوں کی معلومات حاصل ہوں اور دوسرے وہ لوگ میزبان ملک یعنی پاکستان

کی اس جارحانہ جاسوسی سے برگشتہ ہوں کیونکہ بظاہر تعاقب کرنے والے تو پاکستانی ہی نظر آتے تھے۔ لہٰذا اشتراکی ممالک اور پاکستان کے درمیان بُعد پیدا کرنے کی یہ ایک اور چال بھی تھی۔

کوئی بھی غیرت مند ملک اپنی سیکورٹی سروس میں کسی غیر ملک کو اس قدر دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ انٹیلی جنس بیورو کے چند حسّاس افسران نے اس کے خلاف احتجاج کیا اور بصد مشکل ایوب خان کو مجبور کیا کہ یہ سلسلہ ختم کیا جائے۔

ایوب خان نے اپنے دورِ حکومت میں امریکی پالیسیوں کی مکمل اطاعت کی۔ ستمبر ۱۹۵۹ء میں امریکہ کے اشارے پر وہ وزیراعظم ہندوستان، پنڈت جواہر لعل نہرو سے ملا اور مشترکہ دفاع JOINT DEFENCE کے قیام کا مشورہ دیا جس کو نہرو نے رد کر دیا۔ پھر ایوب خان نے کشمیر کے منصفانہ حل کے لئے اپیل کی لیکن یہاں بھی سرد مہری کے سوا کوئی جواب نہ ملا۔ کسی مقام پر بھی خود امریکہ نے ہندوستان کو کسی سمجھوتے کی طرف مائل کرنے کی نہ تو کوشش ہی کی اور نہ ہی ایوب خان یا پاکستان کی خاطر ہندوستان کے خلاف کوئی غیر دوستانہ بیان دیا۔ امریکہ کے لئے ہندوستان کی خوشنودی ہر قیمت پر خاص اہمیت رکھتی ہے کہ ان کی دانست میں یہ تمام علاقے پر اثر رکھنے کی پہلی کڑی ہے۔ ایک موقع ایسا بھی تھا جب خود امریکہ خواہشمند تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جو کشمیر کے مسئلہ کی وجہ مخاصمت ہے۔ اس کا کوئی باوقار حل ہو جائے۔ لیکن ہندوستان کے تیور دیکھ کر وہ فوراً پسپا ہو گیا۔

۱۹۵۹ء میں جان فاسٹر ڈلس کی وفات کے بعد امریکی پالیسی میں تبدیلی آئی۔ ڈلس معاہدات PACTS کے ذریعے اتحاد کا زبردست حامی تھا۔ عراق میں عبدالکریم قاسم کی حکومت کا تختہ الٹنے کے ساتھ ہی عراق اس معاہدے سے نکل گیا جس کو بغداد پیکٹ کہا جاتا تھا اور بعد میں جو سینٹو CENTO کے نام سے زندہ رہا۔ لیکن اس معاہدے میں اب امریکہ کی دلچسپی بھی قدرے کم ہو گئی۔ ٹائم میگزین نے لکھا کہ ۱۹۶۰ء کا سال اس وجہ سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں معاہدات کی جگہ غیر جانبداری کی قدر و منزلت دوچند ہو گئی ہے۔ لہٰذا اب امریکہ نے پاکستان کو نظر انداز کرنا اور ہندوستان کی طرف پیش قدمی کی پالیسی کو تیز تر کر دیا۔ خصوصاً ۱۹۶۲ء میں جب ہندوستان اور چین کے درمیان سرحدی جھڑپوں میں ہندوستان کو بری طرح سے پسپا ہونا پڑا تو امریکہ نے موقع غنیمت جان کر ہر قسم کی فوجی ساز و سامان کی پیشکش کر دی اور بہت سی امداد بھی دی۔

اسی سال پاکستان اور چین کے درمیان باڈر کی حد بندی کے لئے گفت و شنید شروع ہوئی اور دونوں ممالک میں دوستانہ معاہدے کی شروعات بھی ہوئیں۔ امریکہ پاکستان کی اس حرکت پر مزید ناراض ہوا اور پاک امریکہ تعلقات میں ایک خلیج پیدا ہو گئی۔ ایوب خان نے امریکہ کو ہندوستان نوازی کے حوالے سے موقع پرست کہا اور چین کی ناکہ بندی پر تنقید کی۔ پاکستان کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے بیان دیا کہ

پاکستان امریکہ کے ساتھ کئے ہوئے ایسے سیاسی اور فوجی معاہدات پر نظر ثانی کرنا چاہتا ہے کیونکہ امریکہ ہندوستان کو ترجیحاً اسلحہ فراہم کر رہا ہے۔ جو چین کے خلاف تو کیا استعمال ہو گا۔ البتہ پاکستان کے خلاف ضرور کام میں لایا جائے گا۔ کہنے کو تو یہ سب کچھ کہہ دیا گیا لیکن اصل صورت حال یہ تھی کہ پاکستان امریکی قرضہ جات اور دیگر امداد پر اتنا انحصار کئے ہوئے تھا کہ اس مکڑی کے جال سے اس کا نکلنا خارج از بحث تھا۔ ۱۹۶۴ء میں نئی دہلی میں مقیم ایک نامہ نگار نے لکھا۔

"پاکستان آج مشتعل بھی ہے اور ہراساں بھی۔ دس سال کی مستقل دوستی کے بعد بھی امریکہ نے پاکستان کے سب سے بڑے مسئلے یعنی مسئلہ کشمیر کے حل کرانے میں کوئی اقدام نہیں کیا کیونکہ اس میں ہندوستان کی ناراضگی کا خوف ہے۔ بایں ہمہ جب تک ایوب خان اقتدار میں ہے پاکستان مغرب کے ساتھ ہی وابستہ رہے گا۔ اور ایوب کے بعد بھی مغرب کے سوا کون ہے جو پاکستان کو وہ تمام فوجی اور اقتصادی امداد دے گا۔ جس پر اب وہ مکمل انحصار کئے ہوئے ہے۔"

۱۹۶۲ء میں پاکستان کی فوجی امداد میں بہت سی کمی کر دی گئی اور پھر ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ کے بعد یہ امداد مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ تب تک پاکستان امریکہ سے ۱ء۲ بلین یعنی ایک سو بیس کروڑ ڈالر کی فوجی اور دو سو کروڑ کی اقتصادی امداد لے چکا تھا۔ پاک بھارت جنگ کے بعد جب سرکاری طور امریکی اسلحہ کی خریداری پاکستان کے لئے ممنوع ہو گئی تو امریکہ کو یہ خطرہ بھی لاحق ہوا کہ کہیں پاکستان بالکل امریکی چنگل سے آزاد ہو کر اشتراکی کیمپ میں نہ چلا جائے' لہٰذا احتیاطاً یہ انتظام کیا گیا کہ پاکستان کچھ امریکی اسلحہ براہ راست خریدنے کی بجائے پڑوسی ملک کی وساطت سے حاصل کرے۔

پاک۔ امریکی معاہدات

پاک۔ امریکی معاہدات کا تاریخی ترتیب سے مطالعہ دلچسپی کا باعث ہو گا۔ اولاً ۱۱ جنوری ۱۹۵۵ء کو کراچی میں ایک دفاعی معاہدہ DEFENCE SUPPORT ASSISTANCE AGREEMENT کے نام سے مرتب ہوا جس کا مقصد پاکستان کے دفاع کو مضبوط بنانا قرار پایا۔ اس معاہدے کے تحت امریکہ نے پاکستان کو سازوسامان اور دیگر امداد دینے کا بیڑا اٹھایا۔

۱۵ اپریل ۱۹۵۹ء کو انقرہ میں ایک معاہدہ سے ہوا جس کا نام BILATERAL CO-OPERATION AGREEMENT تجویز ہوا۔ اس معاہدے میں واضح طور پر لکھا گیا کہ پاکستان پر حملے کی صورت میں امریکہ پاکستان کی براہ راست امداد کرے گا اور خصوصاً کہا گیا کہ خواہ یہ حملہ ہندوستان کی طرف سے ہی ہو۔

۱۵ اپریل ۱۹۵۹ء کے ایک مزید نوٹ کے مطابق پاکستان پر حملے کی صورت میں امریکہ فوری اور مؤثر امداد کا پابند ہوا۔

۵نومبر ۱۹۶۲ء کو ایک اور AID MEMOIRE امریکہ کی طرف سے موصول ہوا جس میں رقم تھا کہ امریکی حکومت اپنے گذشتہ معاہدات کو دہراتے ہوئے پاکستان کو یقین دلاتی ہے کہ ہندوستان کی طرف سے حملے کی صورت میں پاکستان کی مکمل امداد کرے گی۔

مزید بر آں پاکستان کا SEATO اور CENTO کے معاہدوں کا رکن ہونے کی حیثیت سے بھی یہ مطالبہ بر حق تھا کہ حملہ کی صورت میں دیگر ممبر اور خصوصاً امریکہ اس کے دفاع میں بھرپور مدد کرے۔

۱۹۶۵ء پاک بھارت جنگ

ان تمام واضح اور مفصل معاہدوں کے باوجود جب ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت میں جنگ چھڑی تو امریکہ نے فوری طور اپنے غیر جانبدار ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان امریکہ نواز پاکستانی ٹولے کے لئے نہایت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اور جب مختلف معاہدوں کے باوجود اسلحہ کی ترسیل بھی روک دی گئی تو سب کے حوصلے پست ہو گئے۔ خود ایوب خان کو اپنی مسلسل امریکہ نواز پالیسیوں کی اتنی بڑی ناکامی بہت شاق گزری۔ جنگ کے دسویں ہی دن بعد اس نے امریکہ سے اپیل کی کہ وہ اپنا مثبت کردار ادا کرے کیونکہ اس کا پاکستان اور بھارت دونوں ملکوں میں بہت اثر ہے۔ لیکن وائٹ ہاؤس کے سفارتی ترجمانوں نے کسی قسم کی مداخلت سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن دوسری جانب چین نے پاکستان کی حمایت کا کیا اعلان اور دل کھول کر امداد کی۔ ہندوستان کو جارحیت کا مورد الزام ٹھہرایا۔ نہ صرف یہ بلکہ چین نے ہندوستان کو درپردہ دھمکی بھی دی۔ کہا یہ گیا کہ ہندوستان نے چین کی سرحد کے ساتھ جو فوجی چوکیاں بنالی ہیں وہ چین کے لئے خطرے کا باعث ہیں اور اگر ہندوستان نے فوری طور پر وہ چوکیاں مسمار نہ کیں تو نتائج کا ذمہ دار ہندوستان ہو گا۔ یہ بھی کہا گیا کہ بھارتی سرحد پر سے چینی باشندوں اور بھیڑ بکریوں کو اغوا کر کے لئے گئے ہیں جن کو فوری واپس کیا جائے۔ ہندوستان میں اس الٹی میٹم سے کھلبلی مچ گی اور ایک اور چینی حملے کا منظر نظر آنے لگا۔ ۱۹۶۲ء میں ہندوستان اور چین کی جو مختصر سی جنگ ہوئی تھی۔ اس نے بھارتی نوج اور سیاسی لیڈر شپ کو بوکھلا دیا تھا۔ مزید ہزیمت کی تاب لانا ان کے بس میں نہیں تھا۔ واشنگٹن میں مقیم ہندوستانی سفیر بی۔ کے۔ نہرو نے برملا کہا کہ چینی اپنے الٹی میٹم میں واقعی سنجیدہ معلوم ہوئے ہیں اور حملہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جب واقعات کا دھارا اس طرح بدلا تو امریکہ نے سیکورٹی کونسل میں جنگ بندی کی قرار داد پیش کی اور ہندوستان کو چین کے ہاتھوں مزید ذلت اور شکست سے بچالیا۔

وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے ۴ اور ۶ ستمبر کی قرار دادوں کو ہندوستانی قرار دادوں کا نام دیا۔ کیونکہ ان میں جنگ کی شرائط یہ تھیں کہ جس نے جو علاقہ قبضہ میں لے لیا ہے اس کے پاس رہے۔ ان قرار دادوں کا واضح فائدہ ہندوستان کو پہنچتا تھا۔ آخری قرار داد جو ۲۰ ستمبر کو پیش ہوئی اور جس میں ہر دو ملکوں کی فوجوں کو اپنے اپنے باڈر کے پیچھے واپس جانا تھا' چینی قرار داد کہلائی کیونکہ یہ قرار داد چین کے الٹی میٹم ہی کی وجہ سے پیش بھی ہوئی اور منظور بھی۔ چین کے اس اقدام نے دنیا کی بڑی طاقتوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ حتیٰ



جنرل محمد ایوب خان

کہ خود روس نے ہندوستان کے کشمیر میں جنگ بندی کی لائن پار کرنے پر کڑی تنقید کی اور اسے کہا کہ وہ فوراً اپنی فوجیں بین الاقوامی سرحدوں کے پیچھے بلالے۔

چین کے ساتھ گفت وشنید اور تعلقات بڑھانے کی پالیسی ذوالفقار علی بھٹو کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ تھی جو پاکستان کو مشکل وقت میں آڑے آئی اور اس کامیابی نے بھٹو صاحب کو ملک بھر میں ہردلعزیز بنادیا روس کے ساتھ تعلقات استوار کرنے اور خصوصاً پاکستان میں تیل کی دریافت کی مہم میں روسی امداد حاصل کرنے کا سہرا بھی بھٹو صاحب ہی کے سر تھا خارجہ پالیسی کی اس نمایاں تبدیلی سے پاکستان جو اس سے قبل امریکہ ہی کا کاسہ لیس تھا اب بہت حد تک غیر جانبدار ہو گیا۔ اور یہ بات امریکہ کی حکومت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ للہٰذ تاشقند کے معاہدے کے بعد صدر جانسن نے ایوب کو واشنگٹن طلب کیا اور ہدایت دی کہ وہ بھٹو کو اپنے کابینہ سے نکال دے۔ بھٹو نے وزارت چھوڑی اور ایک الگ سیاسی تنظیم بنالی۔ اس طرح ملک میں پیپلز پارٹی (پی۔ پی۔ پی) کی بنیاد رکھی گئی جو نوجوان طبقہ میں فوراً مقبول ہو گئی۔ اس پارٹی کی روزافزوں ترقی نے ایوب خان کی حکومت کو ہلا دیا۔ یوں بھی تاشقند کے معاہدے کے بعد ایوب خان ذاتی طور پر کمزور پڑ گیا تھا اور حکومت پر اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی۔ ادھر امریکہ کی انتظامیہ نے بھی ایوب خان کو قابل فراموش جان کر اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ جب اس کے خلاف ملک میں تحریک چلی تو سی۔ آئی۔ اے کی طاقت ور مشینری حرکت میں نہ آئی اور ایوب خانی دور کا چراغ سحری گل ہو گیا۔

یحییٰ کا دور حکومت

اگلا دور جو جنرل آغا محمد یحییٰ خان کا مارشل لاء تھا' اس کو بھی امریکی پشت پناہی حاصل تھی۔ معاشی امداد نے یحییٰ کی حکومت کو استحکام بخشا اور تیسرے ملک کی وساطت سے فوجی امداد بھی جاری ہو گئی۔ یحییٰ خان نے بھی اپنی وفاداری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ایک موقع پر اس نے امریکہ اور چین کے درمیان براہ راست خفیہ گفت وشنید شروع کروانے میں ذاتی کردار ادا کیا۔ اس پیش رفت سے امریکی انتظامیہ میں یحییٰ خان کی قدر بڑھ گئی۔ لیکن جب ۱۹۷۱ء میں پھر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہوئی تو امریکہ نے ایک بار پھر اپنا سابق کردار دہرایا۔ ۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان نے باقاعدہ طور پر امریکہ سے کئے ہوئے معاہدوں کے تحت مدد مانگی اور خاص طور پر اس شق کا حوالہ دیا۔ جس میں ہندوستان کی طرف سے حملے کی صورت میں امریکہ پاکستان کی امداد کا پابند تھا۔

> ہنری کسنجر نے خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ ۱۹۵۹ء کے معاہدے کے تحت امریکہ ایسی امداد کا پابند تھا۔

لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ امریکہ نے نہ پاکستان کی مدد کرنی تھی نہ کی۔ دراصل وہ کسی قیمت پر بھی ہندوستان کے ساتھ تعلقات پر ذرا سی خراش کا بھی متحمل نہیں تھا اور نہ شاید کبھی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ نے یہ ضرور کیا کہ وزیر اعظم اندرا گاندھی سے اپیل کی کہ وہ مغربی پاکستان پر حملہ نہ کرے۔

اندرا گاندھی کا اپنا منصوبہ تو یہ تھا کہ مشرقی پاکستان سے نپٹ کر وہ مغربی پاکستان پر حملہ کرے اور پاکستان کی فوج کو مکمل طور پر تباہ کر دے۔ اس منصوبے میں ہندوستان کو روس کی شہ بھی حاصل تھی۔

ہنری کسنجر کا کہنا ہے کہ اس صورت میں بڑے پیمانے پر ایک اور جنگ کا خطرہ بھی تھا۔ ہو سکتا تھا کہ چین پاکستان کی امداد کے لئے آئے اور روس اسے روکنے کے لئے چین پر حملہ کر دے۔ وہ ایک نہایت ہی بھیانک اور تباہ کن جنگ ہوتی جس کے اثرات کو احاطہ خیال میں لانے سے بھی دل کانپ اٹھتا ہے۔ لہٰذا اگر امریکی صدر نے اندرا گاندھی کو مغربی پاکستان پر حملہ کرنے سے روکا تو اس عمل میں پاکستان کی حمایت نہیں بلکہ اپنے نئے اتحادی چین کی بقا کا جذبہ کارفرما تھا۔

دراصل امریکہ نے پاکستان کے وجود ہی کو ہمیشہ سے غیر ضروری سمجھا اور محض اپنی خارجہ پالیسی کی بنا پر اسے برداشت کیا ہے۔ خارجہ تعلقات کی کمیٹی نے یہ بھی کہا کہ امریکہ کوئی خیراتی ادارہ نہیں ہے

ساٹھ کی دہائی سے انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کو ایک ہی برّ صغیر کی حیثیت سے دیکھنا شروع کیا۔ پھر انہوں نے مشرقی پاکستان کو ایک الگ ملک کی صورت میں پہچاننے کی کوشش بھی کی۔ کئی بار اقتصادی امداد کے سلسلے میں انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں باقاعدہ تمیز کے طور پر الگ الگ منصوبے بنانے کی کوشش کی اور قرضہ جات اور امداد کی علیحدہ تقسیم بھی سامنے رکھی۔ لیکن وفاقی حکومت کے احتجاج پر وہ اس حرکت سے باز رہے۔ جب ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں یحییٰ خان کی حکومت کے خلاف تحریک زوروں پر تھی اور مارچ کے پولیس ایکشن کے بعد مشرقی پاکستانیوں ایک بڑی تعداد کی سرحد پار کر کے بھارت منتقل ہو گئی اور وہاں پناہ گزین کیمپ بن گئے تو امریکی نمائندوں نے باقاعدہ ان بغاوت پر آمادہ پناہ گزینوں سے رابطہ قائم رکھا۔ یہاں تک کہ جب ہندوستان کی سرزمین پر بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت بن گئی تو امریکی پالیسی میں یکایک تبدیلی کی لہر آئی۔ نہ صرف امریکہ اپنے معاہدوں سے منحرف ہو کر پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی امداد سے منکر ہو گیا' بلکہ اس نے جلاوطن لیڈروں سے تعلقات استوار کئے اس خیال سے کہ بنگلہ دیش تو بن ہی رہا ہے۔ کیوں نہ ہم اس نئے ملک میں اپنے پاؤں جمانے کے لئے پہلے سے ہی راہ ہموار کر لیں۔

بھٹو کا درمیانی زمانہ

ایوب کے دور حکومت میں بھٹو کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا۔ اس نے روس سے پاکستان میں تیل کی دریافت کا معاہدہ کیا۔ چین سے سرحد کا تصفیہ اس کے دور میں ہوا۔ خاص طور پر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران اور اس کے بعد چین سے دوستی بڑھی۔ علاوہ ازیں اس جنگ کے دوران بطور وزیر خارجہ

بھٹو نے سیکورٹی کونسل میں جو تقریریں کیں۔ (اور جن کو بی۔ بی۔ سی جیسے ذرائع ابلاغ نے اقوام متحدہ کی تاریخ میں بہترین تقریریں کہا) ان میں ہندوستان کی مخالفت بدرجہ اتم موجود تھی۔ ان سب وجوہات کی بناپر بھٹو امریکیوں کو ناپسند تھا۔ لیکن جب ۱۹۷۱ء میں وہ اقتدار میں آیا تو اس نے مغربی ممالک سے اور خاص طور پر امریکہ سے دوستی کے دروازے وا رکھے۔ SEATO اور CENTO دونوں معاہدات میں رکنیت برقرار رکھی اور جہاں سے بھی فوجی اور اقتصادی امداد مل سکی حاصل کی۔ امریکہ سے بدستور تیسرے ملک کی وساطت سے اسلحہ خریدا۔ لیکن امریکہ کبھی بھٹو کی طرف داری پر مائل نہ ہوسکا اور اس نے بھٹو کے مخالفین سے رابطے قائم کئے اور بڑھائے۔ مزید بر آں انہوں نے پاکستانی فوج سے بھی براہ راست رابطہ رکھا۔

اگست ۱۹۷۶ء میں ہنری کسنجر بطور سیکرٹری آف سٹیٹ امریکہ پاکستان کے دورے پر آئے اس نے بھٹو کو اقتصادی اور سیاسی امداد کی پیش کش کی اور شرط یہ رکھی کہ "پاکستان ہندوستان کے مقابلے میں ایٹمی توانائی حاصل کرنے کی کوشش سے دست بردار ہو جائے۔"

بھٹو نے جیسا کہ اس کی شخصیت سے متوقع تھا، ہنری کسنجر کی تجویز کو ٹھکرا دیا۔

اس پر ہنری کسنجر نے تمام ادب، لحاظ اور پروٹوکول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دھمکی دی کہ ہم تمہاری حکومت کا تختہ الٹ دیں گے اور خود تمہاری ذات کو ایک ہولناک مثال بنادیں گے۔

ایک ایسے دوست ملک سے جس کے ساتھ پاکستان کے نصف درجن دوستی اور امداد باہمی کے معاہدے موجود تھے اور جس کا بار بار طوطا چشمی کے باوجود پاکستان نے نظریاتی سطح پر کبھی ساتھ نہیں چھوڑا تھا، اس ملک کی کینہ پروری کی یہ انتہا اپنی مثال آپ ہی ہو سکتی ہے۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ ہنری کسنجر کی دھمکی سوچی سمجھی امریکن قومی پالیسی کی مظہر تھی، وہی پالیسی جو اپنے حواری ممالک سے رتی بھر حکم عدولی کی متحمل نہیں ہوتی۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں جنرل الیکشن کا اعلان ہو چکا تھا۔ مخالف سیاسی پارٹیاں تو بہت تھیں لیکن کسی ایک میں اتنی جان نہیں تھی کہ پیپلز پارٹی کا مقابلہ کر سکے۔ گو ان پارٹیوں میں دائیں اور بائیں بازو کے عناصر تھے اور اکثر تو ایک دوسرے سے بات کرنے کی روادار نہیں تھیں۔ لیکن اچانک سب میں ایک سمجھوتا ہو گیا۔ آپس کے اختلاف بالائے طاق رکھ دئے گئے اور ایک نیا اتحاد جس کا نام پاکستان قومی اتحاد PAKISTAN NATIONAL ALLIANCE رکھا گیا معرض وجود میں آیا۔ گویا ہنری کسنجر کی دھمکی اب عملی صورت میں ظہور پذیر ہو رہی تھی۔ پی۔ این۔ اے کی تنظیم اور اس کے وسائل اس بات کی دلیل تھے



جنرل آغا محمد یحییٰ خان

کہ کوئی بیرونی ہاتھ اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ بھٹو کا کہنا ہے کہ

"جس بات کی مجھے توقع نہیں تھی اور جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ وہ حزب مخالف کی منظم پشت پناہی تھی۔ انکشاف یہ ہوا کہ یہ سلسلہ وسط دسمبر ۱۹۷۶ء سے شروع ہو چکا تھا۔

جنوری ۱۹۷۷ء سے باقاعدہ رپورٹیں آنی شروع ہو گئیں۔ کہ کوئی ہاتھ خفیہ ہاتھ پی۔ این۔ اے کے پیچھے ہے۔ اسی ماہ میں رفیع رضا' وزیر پیداوار نے ساڑھے چار گھنٹے کی طویل ملاقات میں مجھے مفصل طور پر آگاہ کیا کہ قومی اتحاد' یعنی پی۔ این۔ اے معرض وجود میں آ رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس اتحاد کا صدر کون ہو گا۔ دیگر عہدیداران کون ہوں گے۔

اس اتحاد کے لائحہ عمل' مقاصد اور نیت کے متعلق بھی اس نے مفصل بتایا اور آخر میں میرے سامنے تین نعم البدل (ALTERNATIVES) رکھے۔

اولاً کہ میں ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کے قصے کو ختم کر دوں

ثانیاً کہ میں انتخابات ملتوی کر دوں' اور

ثالثاً نہایت خطرناک نتائج کے لئے تیار ہو جاؤں۔

بھٹو کے کہنے کے مطابق انتخابات میں سی آئی اے نے بے دریغ پیسہ خرچ کیا لیکن اس کے باوجود پی۔ این۔ اے حکمران پارٹی کو شکست نہ دے سکی۔ اب پلان کا دوسرا دور شروع ہوا اور انتخابات میں دھاندلی کا الزام لگا کر حکومت کے خلاف ملک بھر میں ہنگامے شروع کرا دیئے گئے۔ اطلاعات کے مطابق ان ہنگاموں پر سی۔ آئی۔ اے نے اتنا روپیہ صرف کیا کہ کراچی میں ڈالر کی قیمت گر گئی۔ ورنہ تاریخ برِ صغیر میں اتنی سی بات پر مسلسل اتنے ہنگامے کبھی نہیں ہوئے۔ خود حزب اختلاف کو اعتراف تھا کہ نہ تو کوئی واحد پارٹی اور نہ ہی سب کے سب مل کر بھی حکمران پارٹی کی مقبولیت کا مقابلہ کر سکتے تھے۔ پیپلز پارٹی کی کامیابی کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی کہ ملک کے کونے کونے میں بیک وقت اتنا منظم اور طویل احتجاج ہوتا' جانوں کا ضیاع ہوتا' انتظامیہ کی تمام تر طاقت استعمال ہونے کے باوجود احتجاج' ہنگاموں' لوٹ مار اور آتش زنی کی صورت میں قائم رہتا۔

بالآخر پی۔ این۔ اے اور حکومت کے درمیان طویل مذاکرات ہوئے اور بہت سی لے دے کے بعد طے ہو گیا کہ الیکشن دوبارہ ہوں۔ الیکشن کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی اور درمیانی وقفہ میں انتظامات پر بھی فیصلہ ہو گیا۔ پورے عہد نامے کا ڈرافٹ تیار ہو گیا۔ اور صرف اس پر دونوں فریقوں کے دستخط ہونے باقی رہ گئے۔ اس اثنا میں ملک بھر میں امن قائم ہو گیا' بنائے مخاصمت جو پبلک کو بتائی گئی تھی' جس کے نام پر ان کو

گلیوں اور بازاروں میں لایا گیا تھا مفقود ہو گئی اور لوگ چین سے گھروں میں بیٹھ کر مذاکرات اور ان کے نتیجہ کا اور پھر نئی الیکشن کا انتظار کرنے لگے۔ ان مذاکرات کی کامیابی ملک اور قوم کے لئے تو بیشک نیک شگون تھی لیکن پس پردہ وہ جو پُتلیوں کا ناچ نچا رہے تھے قدرے مایوس ہوئے۔ لیکن ابھی ان کے مہرے باقی تھے۔ لہٰذا پی۔ این۔ اے کے کچھ لیڈر صاحبان جو مذاکرات میں بھی شامل نہ تھے۔ انہوں نے ڈرافٹ عہد نامہ نامنظور کیا اور خفیہ طور پر فوج کو دعوت دی کہ وہ میدان میں آئے اور اقتدار سنبھالے۔ فوج کے سربراہان پہلے سے ہی تیار بیٹھے تھے۔ عوام کو بالکل سمجھ نہ آسکا کہ ہو کیا رہا ہے' ان کے لیڈران جنھوں نے ان کو ہنگاموں پر قصبوں یا' گلی بازار میں گولیوں کا سامنا کروایا' آگیں لگوائیں اور یہ سب اس لئے کہ الیکشن میں دھاندلی ہوئی تھی' اس لئے کہ الیکشن دوبارہ ہوں' اور اب جب چاروں طرف سے خبریں آ رہی تھیں کہ حکومت دوبارہ الیکشن کرانے کے لئے تیار ہے۔ اب جب کہ مکمل امن ہو چکا تھا تو اس وقت فوج کی مداخلت کا کیا جواز اس سے پیشتر اس کے کہ عوام یہ سوال اپنے لیڈروں سے پوچھیں۔ ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ وطن عزیز میں یہ تیسرا مارشل لاء تھا۔

ضیاء الحق کا حکومت پر قابض ہونا

جس وقت پی۔ این۔ اے ملک میں ہنگامہ آرائی میں مصروف تھی اسی دوران میں امریکی سفیر مقیم پاکستان کا تبادلہ ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق کمانڈر انچیف پاکستان آرمی نے ایک شاندار الوداعیہ سفیر کے لئے اپنے گھر پر دیا۔ میں اس وقت اسلام آباد میں بطور سیکرٹری داخلہ حکومت پاکستان تعینات تھا۔ اور مجھے بھی اس الوداعیہ میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دعوت کچھ زیادہ ہی پر تکلف اور اہتمام میں بڑی رونق تھی۔ کسی سفیر کے تبادلے پر عام طور وزارت خارجہ میں ایک عام سی دعوت دی جاتی ہے۔ اگر سفیر بہت اہم ملک کا ہو تو دعوت نامے سیکرٹری یا زیادہ سے زیادہ وزیر خارجہ کے نام سے جاری ہوتے ہیں۔ فوج کے سربراہ عموماً ایسی دعوتیں نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو سفیروں کی طرف سے دی گئی دعوتوں پر بھی کم ہی جاتے ہیں تا آنکہ کوئی خاص موقع جیسے کسی ملک کا قومی دن منایا جا رہا ہو۔ وہاں بھی فوج کے سربراہ رسماً ہی جایا کرتے ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اگلے دن میں نے وزیر اعظم سے ضمناً ذکر کیا بھٹو جو نہایت زیرک انسان تھے' میرا مطلب سمجھ گئے اور خاموش ہو گئے۔ جب وہ سپریم کورٹ میں اپنے خلاف قتل کے مقدمے میں بیان دے رہے تھے تو انہوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ میرے سیکرٹری وزارت داخلہ نے مجھے اس واقعہ سے آگاہ کیا تھا اور ایک طرح آنے والے حالات کی طرف اشارہ بھی۔

جب پی۔ این۔ اے کی تحریک زوروں پر تھی تو قائم مقام امریکی سفیر کی ٹیلیفون پر ایک اور سفارت کار سے گفتگو پاکستانی انٹیلی جنس کے محکمے نے ٹیپ کر لی اور وزیر اعظم کو سنائی۔ گفتگو میں ٹیپ کا مصرعہ تھا "بھٹو ختم ہو گیا اور کھیل بھی ختم ہو گیا۔ انگریزی میں الفاظ تھے۔ BHUTTO IS FINISHED

THE PARTY IS OVER یہ کہنا بعید از قیاس نہیں ہو گا کہ اس وقت تحریک کو چلانے والے یا تو امریکی سفارت خانے میں موجود تھے یا ان کے بہت قریب تھے جو کہ لحہ بہ لحہ تحریک کی شدت یا کامیابی کی اطلاع سفارت خانے کو پہنچ رہی تھی۔ چونکہ ان کی دانست کے مطابق تحریک مکمل طور پر پلان کے مطابق چل رہی تھی اور کامیابی سے ہمکنار تھی۔ سفیر صاحب نے کسی احتیاط کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے کھلے الفاظ میں اپنے دل کی بات ٹیلیفون پر کہہ دی۔

اس گفتگو کے اگلے ہی روز بھٹو نے اسمبلی کا اجلاس بلایا ہوا تھا جس میں انہوں نے خود خطاب کرنا تھا۔ اس تقریر میں بھٹو نے امریکی سفیر کی یہ گفتگو بھی دہرائی اور بڑے جوش سے کہا۔ THE PARTY IS NOT OVER یعنی کھیل ختم نہیں ہوا۔

لیکن یہ بھٹو مرحوم کی خام خیالی تھی۔ سی۔ آئی۔ اے کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور یہ کہ ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا انھیں اندازہ ہی نہیں تھا۔

سی۔ آئی۔ اے کے افسران ایسی مہمات کا فخر سے ذکر کرتے اور ان کے متعلق لکھتے رہتے ہیں۔ ایران میں مصدّق مرد آہن بن کر نمودار ہوا۔ اس کے ایرانی تیل پر انگریزوں کی اجارہ داری ختم کی۔ شاہ کے مقابلے میں عوام کو سرچشمہ اقتدار ہونے کا تصوّر قائم کرنا چاہا۔ شاہ ایران بوکھلا کر ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ تب سی۔ آئی۔ اے کے دو ماہرین تہران آئے۔ انہوں نے ڈالروں کے تھیلوں کے منہ کھول دئے ور دو دن کے اندر مصدّق کے خلاف ایسی تحریک چلائی کہ بیچارے وزیر اعظم نے روتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد شاہ ایران واپس تہران آیا اور دوبارہ صاحب اقتدار بنا۔ جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں آئے دن یہی تماشہ ہوتا رہتا ہے۔

مارشل لاء کی حکومت ہمیں پھر اسی حیثیت میں لے آئی ہے جہاں ایوب اور یحییٰ نے پہنچا دیا تھا۔ امریکی سریع الحرکت فوج RAPID DEPLOYMENT FORCE کے لئے بلوچستان کے ساحل پر گوادر کی بندر گاہ کو اور بندر گاہ کے پیچھے بہت سے علاقے کو تیزی سے اس قابل بنایا گیا ہے کہ ضرورت پڑنے پر یہ فوج اپنے ڈیگو گارسیا اور فلپائن کے BASES سے چل کر بحیرہ عرب میں آ جائے اور گوادر سے نہ صرف خلیج کے ملک کے تیل کے ذخائر کی حفاظت کر سکے بلکہ خود پاکستان پر بھی نظر رکھ سکے۔ اس طریقے سے پاکستان کی سرزمین پر کسی مستقل اڈے کی ضرورت نہیں رہی اور حکومت بڑے اعتماد کے ساتھ عوام کو یقین دلا سکتی ہے کہ ہم نے امریکہ کو کوئی اڈے فراہم نہیں کئے۔ بعض سیاستدانوں کے حالیہ بیانوں کے مطابق بلوچستان میں ایک نہیں بہت سے ایسے مقام تیار کئے گئے ہیں جہاں امریکی فوج اتر سکتی ہے۔

امریکی ایڈمرل تھامس مورر نے ایک فوجی رسالے STRATEGIC REVIEW میں لکھا ہے کہ جو سہولتیں ایران کے انقلاب کی وجہ سے ناپید ہو گئی ہیں وہ گوادر کی بندر گاہ نے پوری کر دی ہیں۔ اس نے گوادر کو باقاعدہ امریکی بحریہ کا اڈا گردانا ہے۔ اور پشاور کے قریب بڈا بیر والے ہوائی اڈے کو دوبارہ کھولنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اس رسالے میں ایک اور اہم ریسرچ کے شعبہ کے اہم رکن فرانسس فوکایامہ نے ایڈمرل مورر سے اتفاق کیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی مطالبہ کیا ہے کہ کراچی کی بندر گاہ بھی سریع الحرکت فوج کے استعمال کے لئے تیار رہنی چاہئے۔ نیز وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اپنی سریع الحرکت فوج کو حرکت میں لانے سے پہلے پاکستان کی فوج کو بطور ہراول دستہ استعمال کرنا مناسب ہو گا۔ امریکی اور پاکستانی حکام ان تمام انتظامات کی نفی کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ محض اعتراض برائے اعتراض ہے ورنہ کوئی ایسا کاروبار موجود نہیں ہے۔ تو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ کسی بندر گاہ اور اس کے نواحی علاقہ میں اتنی ترقی اور تعمیر معشوق کی کمر تو ہو نہیں سکتی جو کسی کو نظر نہ آئے۔

ایک اور STRATEGIST جو غالباً جرمن نژاد ہے اور جس کا نام LAWNU LIFSCHULTZ ہے فار ایسٹرن اکنامک ریویو FAR EASTERN ECONOMIC REVIEW کے ۱۱ دسمبر ۱۹۸۱ء کے شمارے میں ایڈمرل مورر اور فرانسس فوکایامہ دونوں کے نقطہ نظر کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "امریکہ کے فوجی ماہرین توقع کرتے ہیں کہ ان نئے انتظامات میں ہر قسم کی فوجی ضروریات اور سہولتیں مہیا ہوں۔ خصوصاً فوری طور پر وہاں، یعنی گوادر وغیرہ میں، بھاری مقدار میں سازوسامان اور گولہ بارود مہیا کیا جائے تاکہ سریع الحرکت فوج کو کسی دشواری کا سامنا نہ ہو اور نہ ہی کوئی رکاوٹ۔ امریکی قوت کو علاقے میں برقرار رکھنے کا یہی طریقہ ہے۔"

مارشل لاء حکومت نے امریکہ کو پاکستان کی سرزمین سے سوویٹ یونین کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کے لئے "فری یورپ" اور "ریڈیو لبرٹی" کے ذرائع ابلاغ کو اسلام آباد میں دفتر بنانے کی اجازت بھی دے دی جس پر روس نے پاکستان سے سخت احتجاج کیا اور خود پاکستان میں بھی سیاستدانوں نے اس اقدام کے خلاف آواز اٹھائی۔

افغانستان پر روسی حملے سے جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے، مارشل لاء حکومت نے اس پر جو اقدامات بھی اٹھائے امریکہ کی خواہشات کے مطابق کئے۔ تمام تر افغان پالیسی امریکی اشاروں پر مبنی رہی۔ امریکہ تو چاہتا ہے کہ روس افغانستان میں پھنس کر رہ جائے اور وہاں اس کا وہی حال ہو جو امریکہ کا ویت نام میں ہوا تھا۔ لہٰذا جب بھی افغان قضیہ کا فیصلہ ہونے کی نوبت آئی، پاکستان نے امریکی اشارے پر اس میں

روڑے اٹکائے۔ چالیس لاکھ افغان مہاجرین کا بوجھ پاکستان برداشت کر رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کا خرچ بیشتر امریکہ ہی اٹھاتا ہے لیکن اس کے بدلے میں وہ ان مہاجرین کو اسلحہ بارود دے کر افغانستان میں روسیوں پر حملے کرواتا ہے اور پھر اس پھیلتی ہوئی جنگ کا عالمی پروپیگنڈا روس کے خلاف جاری رکھتا ہے۔ مذاکرات تو محض دکھاوے کے لئے چلتے رہتے ہیں۔ لیکن جب تک امریکہ رضامند نہ ہو پاکستان کوئی فیصلہ نہیں ہونے دے گا۔ سیکرٹری جنرل اقوام متحدہ کا نمائندہ خاص ڈیگو کارڈویز جب کبھی افغانوں اور روسیوں کو فیصلے کی کسی ڈگر پر لے کر آیا ہے تو پاکستان نے کوئی ایسا بیان داغ دیا ہے جس سے تمام کئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

پاکستان کے ان اقدامات سے سب دنیا آگاہ ہے، پاکستانی سیاستدان، سیاسی مبصرین اور عوام تک نالاں ہیں لیکن حکومت وہی مرغے کی ایک ٹانگ والی پالیسی پر اڑی ہوئی ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوئی نتیجتاً نقصان کون اٹھا رہا ہے؟ پاکستانی عوام۔ جب افغان مہاجرین پاکستان کی سرزمین سے چل کر افغانستان میں افغان یا روسی فوجوں پر چھاپے مار کر لوٹتے ہیں تو بین الاقوامی قانون کے مطابق افغان اور روسی فوجوں کو ان کا پیچھا کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس HOT PURSUIT میں پاکستان پر گولا باری ہوتی ہے۔ ہوائی حملے ہوتے ہیں جن سے آج تک سینکڑوں پاکستانی جانیں ضائع ہو چکی ہیں۔

سلیگ ہیری سن (SELIG HARRISON) نے لکھا ہے کہ امریکہ کی افغانستان کے متعلق پالیسی یہ ہے کہ یہ لڑائی جاری رہے جب تک کہ ایک افغان بھی زندہ ہے۔ اس لئے کہ امریکہ تو صرف روپیہ خرچ کر رہا ہے اپنے کسی شہری یا فوجی کی جان بازی پر نہیں لگا رہا ہے۔ افغان مرتے رہیں اور روس کو جنگ میں الجھائے رکھیں تو امریکہ کی جیت ہی جیت ہے۔ SELIG HARRISON کو یہ بھی کہنا چاہئے تھا کہ نہ صرف افغان بلکہ پاکستانی بھی مرتے رہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

پاکستانی مرتے رہیں۔ پاکستان بدنام ہو۔ روس کی دشمنی خواہ مخواہ مول لی جائے۔ پاکستانی عوام، سیاستدان اور مبصرین سر پٹختے رہیں لیکن ضیاالحق کی مارشل لاء حکومت نے جو امریکہ نواز پالیسی بنا دی ہے اس میں سرِمُو فرق نہیں آسکتا کیونکہ باوجود ایک نام نہاد جمہوری حکومت کے قیام کے، تمام تر خارجہ پالیسی جنرل ضیاالحق ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ پالیسی تبھی تبدیل ہوگی جب امریکہ چاہے گا۔

حال ہی میں ایک امریکی سابق سیکورٹی کے مشیر نے پاکستان میں بات چیت کے دوران کہا کہ پاکستان کے پاس تین طرح کے اختیارات ہیں۔ اولاً روسیوں کے ساتھ افغانستان میں بھرپور جھڑپ۔ اس صورت میں پاکستان کی اپنی خیر نہیں۔ ثانیاً چھوٹی موٹی جھڑپیں۔ مہاجرین کے ذریعے سے جو کہ موجودہ صورت ہے اور جس کو جاری رکھا جا سکتا ہے اور "ثالثاً" جنگ بندی اور مصالحت جیسی صورت میں امریکہ کی ناراضگی مول لینی ہوگی۔ یہ خطرہ پاکستان کی موجودہ حکومت ہرگز برداشت نہیں کر سکے گی۔

قصہ کوتاہ ہمارے عظیم دوست محسن اور غم گسار ملک امریکہ نے آج ہمیں ایک ایسی ابتلا میں جکڑ دیا ہے کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ معاشی بد حالی' سیاسی نقاہت اور اس اقتدار پر ان لوگوں کا قبضہ جو کسی صورت بھی امریکہ سے رو گردانی نہیں کر سکتے کہ ان کی اپنی بقا کی گارنٹی ہی امریکہ کی بندہ پروری پر منحصر ہے۔ بیچاری جمہوری حکومت کرے بھی تو کیا۔ سانپ کے منہ میں چھپکلی' چھوڑے تو اندھا' نگلے تو کوڑھی۔

۳۱ جنوری ۱۹۸۰ء کو EUROPEAN MANAGEMENT FORUM کے ایک اجلاس DAVOS SYMPOSIUM میں تقریر کرتے ہوئے ہنری کسنجر نے کہا

"تین ممالک ہماری خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ جن کے متعلق میں سوال اٹھاؤں گا اور ہم سب کو ان سوالات کا جواب دینے یا ڈھونڈنے کی ضرورت ہوگی کیونکہ میں خود کوئی حتمی جواب نہیں دے سکتا۔ یہ ممالک ہیں خلیج فارس کے علاقے کی بادشاہتیں پاکستان اور چین۔ ضروری ہے کہ ہم ان کے متعلق اپنی پالیسی میں ہم آہنگی بھی رکھیں اور مکمل احتیاط بھی کہ ہم کوئی ایسا خطرہ مول نہ لیں جس سے امریکہ کو ایک بار پھر ہزیمت اٹھانی پڑے۔ لہٰذا ہم ان ممالک کے لئے جو کچھ بھی سوچیں یا کریں نہایت احتیاط سے قدم پھونک پھونک کر کریں اور ساتھ ہی یہ بھی خیال رہے کہ اگر ہم ان ممالک کے معاملے میں اپنے آپ کو الجھاتے ہیں تو ہمارا ہی پلّہ بھاری رہے اور بالادستی ہر طرح سے ہماری رہنی چاہیے۔ ورنہ نتائج ہمارے لئے بہت ہی خطرناک ہو سکتے ہیں۔

اس ضمن میں پاکستان اضافی طور پر اشتراکی روس کا ہدف بن گیا ہے کیونکہ وہ بیک وقت امریکہ کا بھی دوست ہے اور چین کا بھی۔ لہٰذا پاکستان کے ٹوٹ جانے سے علاقے کے دیگر ممالک پر بہت گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ جہاں تک HOT PURSUIT کا تعلق ہے وہ تو کوئی خاص مسئلہ نہیں یعنی اگر افغان اور روسی فوجیں سرحد پار گولہ باری اور بمباری کرتی رہیں اور پاکستانی مرتے رہیں اور املاک تباہ ہوتی رہیں تو یہ امریکہ کے لئے کوئی خاص قابل توجہ مسئلہ نہیں لیکن جہاں تک سوال روس کے پاکستان پر بھرپور حملے یعنی کھلی جنگ کا ہے تو اس صورت میں کم از کم مستقبل قریب میں بغیر بیرونی امداد کے پاکستان ایسا حملہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس صورت کا بھی ہمیں جائزہ لینا ہو گا۔"

اس تقریر کے متن سے دو باتیں صاف ظاہر ہیں۔ ایک تو یہ کہ امریکہ اپنی امداد کے بدلے میں مکمل

اطاعت چاہتا ہے۔ پہلے پیرا گراف کے آخر کے الفاظ "اور بالا دستی ہر طرح سے ہماری رہنی چاہئے" جنگ میں برتری نہیں بلکہ اس غریب ملک کی پالیسیوں پر برتری مراد ہے جو امداد کے جال میں پھنسا ہوا ہے ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ وطن عزیز کو اس یتیمانہ حال تک پہنچانے والے ہمارے ہی ارباب اقتدار ہیں لیکن جب ہماری خارجہ پالیسی پر کوئی مؤثر بحث ہی ممکن نہیں تو پھر قہر درویش بر جانِ درویش کے علاوہ اور چارہ کار ہی کیا ہے۔ دوسری بات جو اظہر من الشمس ہے وہ یہ ہے کہ ہم پر جو بھی گزرے امریکی دوست ہماری مدد کے لئے یا یوں کہیئے کہ ہمارے خون کے لئے اپنا پسینہ بھی بہانے کے لئے تیار نہیں۔ ہمیں ایک ایسی پوزیشن میں دھکیل کر کہ جہاں ہماری بقا ہی خطرے میں ہے اور وہ خود اس ملک کے ٹوٹ جانے کی تشویش کا اظہار بھی کرتے ہیں' اب یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر پاکستان پر ایسی کوئی افتاد پڑی تو انہیں کیا کرنا چاہئے یا کچھ کرنا بھی چاہئے یا نہیں۔ جہاں تک 'نصیب دشمناں' ملک ٹوٹ جانے کا ذکر ہے امریکہ کو یہ افسوس نہیں کہ بیچارا پاکستان ہمارا اچھا دوست ہوا کرتا تھا' انہیں تشویش اس بات کی ہے دیگر علاقہ پر اس حادثے کا بُرا اثر پڑے گا۔ یعنی امریکی اثر کم ہو جائے گا۔

ایک سوال جو رہ رہ کر ہر ذہن میں ابھرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہمارے فوجی حکمرانوں نے ملک کو ایسے نامساعد حالات سے کیوں دوچار کیا' اور ہمیں اپنے اتنی قریب واقع ایک سپر پاور سے ٹکرا دیا' ایک ایسی طاقت جس کے ساتھ ہمارا قطعی کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ جب فوجی حکومت اپنے اقتدار میں رہنے کے لئے جواز پیدا کر رہی تھی تو پہلے تو اسلام کو بروئے کار لانے کی کوشش کی گئی۔ جب عوام اس دعویٰ تبلیغ سے متاثر نہ ہوئے تو امریکی امداد کا سہارا لیا گیا۔ ۲ء۳ بلین یعنی دو سو تیس کروڑ ڈالر کی امداد اور اسلحہ خریدنے پر پابندی کی منسوخی کام آئی۔ یہ امداد ظاہر ہے کہ اسی شرط پر تھی کہ ہماری افغان پالیسی خواہ ہمارے لئے کتنی ہی خطرناک ہو' امریکی پالیسی کا عکس ہونی چاہئے۔ اقتدار میں رہنے کی یہ قیمت حکمرانوں نے دینا منظور کی۔ کیونکہ فیصلے تمام انہی کے ہاتھ میں تھے۔ عوام تو صرف یہی کہہ سکتے تھے کہ

؎ تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

حسن گردیزی نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا ہے کہ

"موجودہ حالات کے تحت پاکستان کو روس کے بھرپور حملے کا خطرہ ہے بھی یا نہیں۔
یہ ایک قابل بحث سوال ہے لیکن جو بات سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ ہے کہ کیا دو سو تیس کروڑ ڈالر کی اقتصادی اور فوجی امداد پاکستان کو اس قابل بنا سکتی ہے کہ حملے کی صورت میں وہ اپنا مؤثر دفاع کر سکے؟

یہ سوال ہی در اصل اپنا آپ جواب ہے۔ عرب ممالک کا سونا چاندی ہو یا امریکی اسلحہ کے انبار' روس کے حملے کے سامنے پاکستان جیسے ملک کی مداخلت کوئی معنی نہیں رکھتی۔

عرب ممالک کے حوالے سے یہ بھی کہتا چلوں کہ فوجی حکمرانوں نے سعودی عرب اور خلیج کے دیگر ممالک میں پاکستانیوں کے دستے بادشاہوں اور شیوخ کی ذات اور حکمرانی کے دفاع کے لئے بطور کمک بھیج رکھے ہیں۔ سعودی عرب میں دو ڈویژن یا زیادہ تعینات تھے۔ جو اب غالباً واپس آ رہے ہیں۔ بات آمریت کی ہے۔ ——————— 'ایک دوسرے سے ہمدردی اور تقویت پہنچتی ہے۔ نام ظاہر ہے کہ اسلام کا ہی لیا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست کی حفاظت اور بقا در پیش ہے۔

پاکستانی فوج کی تعمیر میں امریکی امداد کا عنصر سب سے زیادہ ہے گو جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے 'اس کی تعمیر کی قیمت میں ملک کو اپنی خارجہ پالیسی امریکی دفتر خارجہ کے پاس رہن رکھنی پڑی اور اس دفتر کی اطاعت ہم پر لازم ہو گئی۔ خصوصاً جب کبھی آمرانہ نظام حکومت رائج ہوا۔ امریکہ دو قسم کے حربے استعمال کرتا ہے۔ جب فوج مکمل طور پر امریکی اسلحہ اور گولا بارود پر انحصار کرتی ہو تو امریکہ کی ناراضگی فوج کو ناکارہ بنا سکتی ہے۔ اگر بندوق ہے اور گولی نہیں تو ظاہر ہے کہ بندوق بیکار ہے۔ لہٰذا پاکستانی حکمرانوں اور خصوصاً فوجی حکمرانوں کو امریکہ کی خوشنودی ہر طور ضروری ہوتی ہے۔ دوسرا حربہ قدرے مہذب لیکن اتنا ہی مؤثر ہے اور وہ ہے ہزاروں فوجی افسران کو تربیت کے لئے امریکہ بلانا اور ان پر امریکی تمدن کا جادو جگانا' تا کہ ان کی سوچ امریکی سوچ سے ہم آہنگ ہو جائے۔ ملٹری کا امدادی پروگرام MILITARY ASSITANCE PFOGRAMME تیسری دنیا کے ممالک کے لئے ایک خاص امریکی شعبہ ہے۔ اس شعبہ کے ایک بڑے افسر نے امریکی سینیٹ کی دفاعی سب کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا۔

"اس پروگرام کے دو مقاصد ہیں۔ اول یہ کہ اس میں حصہ لینے والے ممالک کی دفاعی قوت میں اضافہ ہو اور آپس میں ان کا رابطہ بڑھے اور دوئم ہمارے اپنے سیاسی مفاد کے زیر نظر فوجی افسران سے فرداً فرداً رابطہ قائم کرنا کیونکہ ان میں سے ہزاروں بعد میں اپنے ممالک میں لیڈر شپ سنبھال لیتے ہیں۔ لہٰذا ایسے افسران کو امریکی زندگی اور امریکی اداروں کی چاشنی سے روشناس کرانا ہمارے لئے سیاسی طور پر بہت مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر امریکہ میں یہ تصور قائم ہے اور بجا طور پر کہ تیسری دنیا میں کسی نہ کسی صورت اور کبھی نہ کبھی فوجی حکومتیں بنتی رہیں گی۔ یا کم از کم فوجی افسران حکومتوں میں شامل رہیں گے' لہٰذا اوائل میں ہی ان کو زیر اثر یا زیر دام کر لینا ایک سیاسی قدم ہے یا ایک پس انداز INVESTMENT ہے جو وقت آنے پر کام آ سکتا ہے۔

پاکستانی جنرل فضل مقیم نے اپنی کتاب میں اور واضح طور پر کہا ہے۔

"اس ٹریننگ پروگرام کے تحت بہت سے کورس اور بہت سے دورے

فوجی افسران کے لئے مرتب ہوئے تا کہ ان کو امریکی اسلحہ اور تکنیک سے روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ ان ٹریننگ کورسوں، دوروں اور ملاقاتوں نے پاکستانی افسران پر گہرا اثر ڈالا اور اونچے درجے کے کمانڈر صاحبان اور سٹاف، حتیٰ کہ پوری فوج کی تنظیم پر امریکی سوچ غالب آئی۔

سب نہیں تو بیشتر فوجی کمانڈر ان ٹریننگ کورسوں، دوروں اور ملاقاتوں سے فیض یاب ہو چکے ہیں اور ہوتے رہے ہیں جن سے لامحالہ ان کے اذہان پر امریکی نظریات اور امریکی ماحول خاطر خواہ اثر چھوڑتا ہوگا۔ امریکی حکام اس بارے میں بغیر کسی کسر نفسی سے دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے پاکستانی فوج کو امداد دے کر مضبوط بنایا ہے اور کہ پاکستانی فوج اپنے ملک میں سب سے زیادہ منظم جماعت ہے جس نے بقول ان کے ملکی وفاق کو استحکام بخشا ہے اور پاکستان کو SEATO اور CENTO جیسے دفاعی معاہدوں میں شرکت پر آمادہ کیا ہے۔ جو بات ان امریکی حکام نے کھل کر نہیں کی لیکن جو روز روشن کی طرح واضح ہے وہ یہ ہے کہ پاکستانی فوجی افسران امریکہ میں تربیت پانے کے بعد اپنے ملک کو اور خاص طور ملک کی خارجہ پالیسی کو سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی پالیسیوں سے ہم کنار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔

اخلاقی نقطہ نگاہ

سابق نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر عبدالولی خان نے ایک بیان دیا تھا جو ۱۲ دسمبر ۱۹۸۳ء کے شمارہ جنگ میں شائع ہوا۔

> "مارشل لاء کی حکومت پر تنقید کرتے ہوئے ولی خان نے جان فاسٹر ڈلس کے ایک بیان کا حوالہ دیا جس میں کہا گیا تھا کہ امریکی خارجہ پالیسی کے دو سیدھے سادے اصول ہیں۔ اگر کسی ملک کو امریکہ سے تعلقات کی توقع ہے تو ایک تو وہ سو فی صد امریکہ کے حق میں ہو مراد یہ کہ ہر سیاہ و سفید میں اس کی تائید کرے اور دوسرے خود اپنے ملک میں اندرونی امن و امان رکھنے کا اہل ہو۔ امن قائم کرنے کے لئے وہ کیا ذرائع استعمال کرتا ہے، اپنے شہریوں کے حقوق سلب کرتا ہے یا ان کو ہر قسم کی آزادی سے محروم کرتا ہے، اس بات سے امریکہ کو کوئی واسطہ نہیں۔ امریکی امداد چاہیے تو ہر قیمت پر اندرونی امن قائم کرو۔ ولی خان نے کہا کہ ایسا امن مارشل لاء حکومت سے اور کون بہتر قائم کر سکتا ہے۔"

ولی خان نے ایک اور بیان میں جو ۱۹ اپریل ۱۹۸۴ء کے جنگ کے شمارے میں شائع ہوا یہ انکشاف کیا کہ اتفاق سے ایک خفیہ دستاویز ان کے ہاتھ لگ گئی جس میں

لکھا ہوا تھا کہ امریکہ ضروری سمجھتا ہے کہ پاکستان اس کے زیر اثر رہے کیونکہ پاکستان کی سرزمین سے پرواز کر کے امریکن ہوائی جہاز روس کی اسلحہ ساز فیکٹریوں پر بمباری کر سکتے ہیں اور خلیج کے ممالک کے تیل کے ذخائر کی حفاظت بھی۔ ولی خان کا کہنا ہے کہ ۱۹۵۸ء میں ہی امریکی پالیسی ساز اس نتیجہ پر پہنچ گئے تھے کہ پاکستان میں سیاسی حکومت کسی وقت بھی بے راہ روی پر اتر سکتی ہے لہٰذا یہاں فوجی حکومت ہی موزوں ہے کیونکہ فوجی ہمارے خیر خواہ اور ہم خیال ہیں اور فوجی حکومت کے عہد میں ہی ہماری پالیسیاں فروغ پا سکتی ہیں۔

جب کوئی سیاسی حکومت ملک میں قائم ہوتی ہے تو سی۔ آئی۔ اے اپنے ایجنٹوں کو اس حکومت کے خلاف کارروائیوں کا حکم دے دیتا ہے۔ ولی خان نے بے دھڑک ہو کر کہا ہے کہ یہ ایجنٹ خریدے ہوئے ادیب' ملّا اور وہ حکمران ہیں جن میں جذبہ حب الوطنی کا شائبہ تک نہیں' مذہب سے بے بہرہ ہیں اور ضمیر نام کی کسی چیز کو نہیں جانتے اور جن کے لئے امریکہ کی خوشنودی اور ڈالر ہی سب سے بڑا انعام ہے۔

ہنری کسنجر نے ۱۵ جولائی ۱۹۷۵ء کو اپر مڈویسٹ کونسل' منیاپولس سے امریکہ کی خارجہ پالیسی کے اخلاقی پہلوؤں پر خطاب کرتے ہوئے کہا۔

دنیا میں تقریباً ایک سو پچاس ممالک ہیں۔ ان میں مشکل سے بیس ایسے ہونگے جہاں صحیح قسم کی جمہوریت قائم ہے۔ بقیہ اقوام سیاسی اور نظریاتی اقدار میں ہم سے مختلف ہیں۔ س کے باوجود ایشیا' افریقہ' یورپ اور لاطینی امریکہ میں کئی ایسے ممالک سے ہمارے تعلقات ہیں۔ ہم استبداد کی کبھی حمایت نہیں کریں گے۔ کہ یہ ہماری اپنی اخلاقی اقدار کی نفی ہے۔ علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ جو حکومت اقتدار کی غاصب ہے وہ پائیدار نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہم ایسی حکومتوں کے ساتھ محدود تعلقات ہی رکھ سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم استبداد اور ظالمانہ عمل کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہ ہماری روایت ہے اور اسی میں ہمارا مفاد ہے۔

امریکہ ایک بہت بڑا ملک ہے۔ ترقی یافتہ اور اتنا طاقت ور کہ تاریخ انسانی میں کبھی اتنی طاقت کسی اور ملک یا قوم کو نصیب نہیں ہوئی۔ ایسے ملک کی خارجہ پالیسی کا یہ اخلاقی پہلو واقعی قابل تعریف ہے بشرطیکہ جو کہا گیا ہے وہ واقعی ہی ایسا ہو۔ لیکن جیسا کہ دنیا جانتی ہے۔ حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ کسی دوست ملک کی حکومت کا تختہ الٹ کر اس پر مارشل لاء مسلّط کر دینا کونسی اخلاقی قدر کی تعریف میں آتا ہے؟ اور پھر مارشل لاء سے سوائے استبداد کے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ کیا ایذا رسانی کے سامان اور آلے امداد میں مہیا نہیں کئے جاتے؟

بہرطور خود ہنری کسنجر نے ہی اس اخلاقی اڑان کی بلندی سے قدرے حقیقت کی سطح پر آتے ہوئے اسی خطاب میں مزید فرمایا۔

> "لیکن سچائی ہمیں اپنی حدود کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم دوستانہ مشورے سے استبداد کو روک سکتے یا سختی کے رویے سے؟ اور پھر اس بات کا تعین کرنا بھی لازمی ہے کہ کسی ملک میں داخلی امور کا کیا رُجحان ہے' اس کی تاریخ کیا کہتی ہے اور اسے حال میں کیا اور کیسا خطرہ لاحق ہے۔ جن ممالک کو طاقتور آمرانہ ہمسایوں سے پالا پڑا ہوا ہے۔ ان کے لئے خاص سلوک روا ہے خواہ وہ اخلاقی اقدار کی سطح پر پورے نہ اترتے ہوں

کسی ملک میں جمہوری نظام کو تہہ وبالا کر کے اس کی جگہ مارشل لاء کی آمریّت کا مسلّط کر دینا اور پھر ایسے دعوے کرنا کہ ہم اخلاقی اقدار کے علمبردار ہیں صرف امریکہ ہی کر سکتا ہے۔ بہرصورت ایسے عمل کے مرتکب ہونے کا جواز جو اوپر دیے گئے اقتباس میں رقم ہے ایک مضحکہ خیز اور بھونڈی کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

یہی حضرت' یعنی سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) ہنری کسنجر ۳۱ جولائی ۱۹۸۰ء کو COMMISSION FOR ENERGY AND NATIONAL RESOURCES کے سامنے اس مضمون کی مزید توضیح فرماتے ہیں۔

> جنگ عظیم کے بعد سے امریکہ سیاست کے نئے رُجحانات کے لئے کوئی تھیوری قائم نہیں کر سکا۔ بدقسمتی سے اس سلسلے میں اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے اس سے معاملات زیادہ اُلجھ کر رہ گئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے ہمیں مشکلات کا سامنا اس لئے پیش آرہا ہے کہ ہم دوسرے ملکوں میں ان لیڈروں کی پشت پناہی کر رہے ہیں جو نہ تو عوام کی نمائندگی کرتے ہیں اور نہ ہی ان کو عوام کی تائید حاصل ہے۔ کوشش تو یہ ہونی

چاہئے کہ ہم اس رُخ پھریں جو رُخ کسی ملک کے عوام کا ہو اور اس صورت کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ عوام اور حکومت میں کوئی ٹکراؤ نہ ہو۔ لہٰذا ہم دنیا بھر میں دوست حکومتوں کو ایسی صورت اختیار کرنے پر مجبور کرتے رہتے ہیں کہ عوام کے ساتھ ٹکراؤ نہ ہونے دیا جائے

حقیقت بہت مختلف اور پیچیدہ ہے۔ بہت سی ایسی نام نہاد ترقی پسند حکومتیں ہیں جو استبداد ہی سے ملک میں امن برقرار رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہم ان حکومتوں کو صحیح تسلیم کر لیتے ہیں جو ہماری دوستی کے باوجود عوام کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتے رہتے ہیں اور کامیابی کے ساتھ ٹکراؤ کا موقع ہی پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ ایسی آمرانہ حکومتیں حقوق انسانی کی نفی کے باوجود ہماری تنقید کا ہدف نہیں بنتیں۔ (۳۰)

اس تقریر کے اقتباس کا پہلا حصہ تو ایک صداقت کو تسلیم کرتا ہے اور اپنی اخلاقی پستی کا اعتراف بھی۔ دوسرے حصے میں ایسی صداقت کا جواز ڈھونڈنے کی ایک بھونڈی سی کوشش ہے جسے صرف خوش فہم امریکی ہی مان سکتے ہیں استبداد اور حقوق انسانی کی نفی کو نہ صرف نظر انداز کرنا بلکہ اس کی حمایت کرنا اور آمریت کی دست گیری کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے جب یہ آمریت خود امریکہ کی مدد سے یا امریکہ نے ہی از خود غریب عوام پر مسلط کی ہو۔ چنانچہ فلسفیانہ منطق سے قصور وار غریب عوام کو یا ان کی تاریخ و جغرافیہ کو ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے کیا یہ منطق اور فلسفہ وہ خون کے دھبے دھو سکتا ہے جو غاصب آمر بہاتے ہیں، یا بڑی طاقتیں اس سے بری الذمہ ہو سکتی ہیں جو ان آمروں کو اقتدار غصب کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

خود امریکہ میں کسی ذی حس انسان کو اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ ان کی حکومت نے بہت سے غاصبوں کو اقتدار دلوایا ہے اور بعض ایسے غاصبوں کی حکومت کے ساتھ امریکہ مکمل طور پر ملوث ہے۔ ڈومینکن ریپبلک۔ کیوبا (BATISTA) جنوبی کوریا۔ ایران (شاہ) ایتھوپیا، ایوبیا۔ زائرے پرتگال۔ سپین۔ یونان اور دیگر کئی ملکوں میں امریکہ نے کسی نہ کسی وقت ان آمروں کی پشت پناہی کی جو عوام دشمن تھے۔ اسی طرح عربوں اور خصوصاً فلسطینیوں کے خلاف اسرائیل کی انتہائی بد اصولی پر مبنی حمایت، جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کی حمایت اور پھر پاکستان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے یا ہو رہا ہے۔ یہ سب امریکہ کی بدترین، غیر اخلاقی خارجہ پالیسی کی مثالیں ہیں۔ اس پالیسی کی تکمیل میں بدنام زمانہ سی۔ آئی۔ اے نے خاص مہارت پیدا کر رکھی ہے اور پاکستان ان کے لئے ایک اچھی خاصی ٹریننگ گراونڈ ثابت ہوا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ امریکہ کے ساتھ رابطہ ایسا ہی جیسا کہ کسی کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال دیا ہو، جو مسلسل گوشت میں پیوست ہوتا چلا جائے اور جب کبھی وہ غریب غلط سمت میں حرکت کرے تو پھندا اور سخت ہو جائے۔ ایسی ہی غلط سمت کی حرکت بھٹو مرحوم سے سرزد ہوئی تھی جب اس نے اپنی خارجہ

پالیسی کو کسی قدر آزاد کرنے کی کوشش کی' روس کے ساتھ صف آرائی ختم کی، ہندوستان سے تعلقات بہتر کیئے، ایران اور عرب ممالک سے مثالی دوستی قائم کی' چین سے دوستی کو مزید مضبوط کیا' افغانستان سے ڈیورنڈلائن پر افغان۔ پاکستان سرحد کا تنازعہ طے کیا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا بھٹو نے سردار داؤد' وزیر اعظم افغانستان سے متعدد خفیہ ملاقاتوں کے بعد یہ طے کرا لیا تھا کہ افغان حکومت ڈیورنڈ لائن کو افغان۔ پاکستان سرحد تسلیم کرے گی۔ دستاویزات مرتب ہو گئی تھیں اور مناسب موقعہ پر ان پر دستخط ہونا اور اعلان کرنا باقی تھا۔ پاکستان پر یہ شرط عائد تھی کہ حیدر آباد سازش کیس جس میں این۔ اے۔ پی کے متعدد لیڈر بشمول عبدالولی خان ملزمان تھے' واپس لے لیا جائے اور تمام ملزمان کو آزاد کر دیا جائے' پیشتر اس کے یہ موقع آتا جنرل ضیاالحق کا مارشل لاء لگ گیا۔ تیس سال سے ڈیورنڈلائن کے تنازعہ نے افغانستان اور پاکستان کے تعلقات انتہائی خراب کئے ہوئے تھے۔ اس تنازعہ کا حل کسی حکومت کے لئے بھی ایک طرۂ امتیاز ہوتا۔

جنرل ضیاالحق نے بات آگے بڑھانے کی کوشش کی' سردار داؤد سے کابل میں ملاقات کی' واپس آ کر حیدر آباد سازش کیس واپس لے لیا' لیکن وقت نے ساتھ نہ دیا اور بائیں بازو کی بغاوت میں سردار داؤد خود ہی قتل ہو گیا۔ اور اس طرح سے تنازعہ ڈیورنڈلائن جوں کا توں ہی رہا۔

گذشتہ مارشل لاء کی خارجہ پالیسی یا شاید تینوں مارشل لاء حکومتوں کی خارجہ پالیسی کا انداز یہ ہے کہ ہمارے تعلقات ہمارے ہمسایہ ملکوں سے ناگفتہ بہہ ہیں خصوصاً ایک ایسی سپر پاور سے جو ہماری شہ رگ کے قریب واقع ہے اور یہ سب اس لئے کہ ہمارے آقا امریکن جو ہم سے بیس ہزار میل دُور بیٹھے ہیں ایسا ہی چاہتے ہیں۔ امریکہ کی دوستی کا امتحان تو ہم کئی بار کر چکے ہیں۔ راجیو گاندھی وزیر اعظم بھارت کے دورۂ امریکہ کے بعد سنجیدہ طور پر یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ امریکہ کسی وقت بھی بھارت کی خوشنودی کی خاطر پاکستان کی پشت پناہی سے ہاتھ کھینچ لے گا۔

روزنامہ جنگ اور نوائے وقت نے ۲ دسمبر ۱۹۸۵ء کے شماروں میں بیک وقت U.S.NEWS AND WORLD REPORT کے ایک مضمون کا ترجمہ شائع کیا جو کچھ یوں تھا۔

> "ہند چینی جنگ ۱۹۶۲ء کے بعد سی۔ آئی۔ اے کی خفیہ مدد جو افغان قبائلی مہاجرین کو مل رہی ہے' رقم اور تعداد کے اعتبار سے ریکارڈ ہے۔ صحیح اعداد و شمار تو ابھی تک صیغۂ راز میں ہیں لیکن معلوم ہوا ہے کہ کانگریس کی منظوری سے ۱۹۸۳ء میں جو رقم ۸۶۵ کروڑ ڈالر اسلحہ اور سازو سامان کے لئے مختص کی تھی وہ بڑھا کر ۲۵ کروڑ ڈالر سالانہ کر دی گئی ہے۔

ابھی تک جو امریکن امداد ان افغان مجاہدین کو دی گئی اس میں زیادہ عنصر روسی اسلحہ کا ہے۔ جو مشرقِ وسطیٰ سے خریدا جاتا ہے۔ مجاہدین کو سی۔ آئی۔ اے فضا میں سے لی ہوئی تصویروں سے روسی فوجوں کی نقل و حرکت کی خبریں بھی مہیا کرتی رہتی ہے۔ تاکہ چھاپہ مارنے میں ان کو آسانی ہو اور روسی حملوں سے بھی بچاؤ ہو سکے۔

پاکستان اسلحہ کی ترسیل و تقسیم کنٹرول کرتا ہے اور یہ خوف بھی رکھتا ہے کہ افغان جنگ کہیں پھیل کر اسے بھی لپیٹ میں نہ لے لے۔ گو پاکستان اس امر سے انکار کرتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے یہ تمام اسلحہ کراچی سے لے کر مجاہدین کے کیمپوں تک پاکستان کی فوجی انٹیلی جنس کے یونٹ ہی اپنے کنٹرول میں لے جاتے ہیں۔
اس تمام کارروائی کے جواب میں افغان اور روسی طیارے اکثر پاکستان کی سرحد پر واقع مجاہدین کے اڈوں پر بمباری کرتے رہتے ہیں۔

فوجی حکمران زندگی کے حقائق سے روپوشی کرتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ سامراجی طاقتیں کبھی قابلِ اعتماد دوست نہیں ہو سکتیں، وہ ان پر تکیہ کرتے ہیں۔ لیکن کریں بھی کیا؟ اپنے ملک میں اقتدار غصب کر لینے سے ان کو نہ تو نمائندہ حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اور نہ ہی قوم کا اعتماد۔ اس لئے ضرور تاوہ اپنے نجی مفاد کی خاطر سامراجی آقاؤں کے حلقہ بگوش بنے رہتے ہیں۔ خواہ اس دوستی پر کتنے ہی قومی مفادات قربان کرنے پڑیں۔ پاکستان کے دفاعی معاہدوں یعنی SEATO اور CENTO میں رکنیت' امریکہ کو فوجی اڈے دینے کی پیشکش 'روسی سرزمین پر جاسوسی طیارے یو۔ ۲ کی پرواز کے لئے پشاور میں اڈا بنانے کا اہتمام 'امریکی سریع الحرکت فوج کے لئے بلوچستان کے ساحل پر سہولتیں مہیا کرنا' چالیس لاکھ افغان مہاجرین کو پاکستان میں پناہ دینا اور پھر ان سے روسی فوج پر حملے کروانا' یہ سب کے سب اقدامات ہمارے قومی مفادات کے صریحاً خلاف ہیں۔ بلکہ ان اقدامات سے روس جیسی ہمسایہ سپر پاور کی دشمنی مول لینا' خود کشی کی پالیسی کے مترادف ہے۔ کوئی نمائندہ حکومت جو عوام کو جواب دہ ہو۔ ایسی پالیسی کو اختیار کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ فقط آمرانہ حکومتیں جنہوں نے جمہور کو بندوق کی نالی کے سامنے رکھ کر اقتدار پر قبضہ کر رکھا ہو اور جو عوام کے سامنے جواب دہ نہ ہونے پر فخر محسوس کرتے ہوں، ایسی تباہ کن راہیں اختیار کرتی ہیں۔

آئین اور مارشل لاء

آئین ہر ملک کے اندرونی اور بیرونی استحکام کا ضامن ہوتا ہے۔ جمہوری اداروں کی تشکیل، تقریر و تحریر کی آزادی، بنیادی حقوق کا تحفظ، عدلیہ کی آزادی اور قانون کی بالادستی آئین ہی کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ سیاسی، معاشی اور معاشرتی مقاصد اور ان کے حصول کی حکمت عملی آئین کا حصہ ہوتی ہے۔ غرضیکہ آئین ملک و قوم کی شخصیت کا تعین کرتا اور آزاد اور باوقار نجی و اجتماعی زندگی کی ضمانت دیتا ہے۔

بابائے قوم حضرت قائد اعظم نے آئین کے بنیادی اصولوں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔

> ''میں نہیں جانتا کہ بالآخر آئین کس شکل میں نمودار ہو گا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ اسلام کے جمہوری اصولوں پر مبنی ہو گا۔ اسلام ہی نے ہمیں جمہوریت کا سبق دیا ہے۔ اس نے ہمیں انسانوں کی برابری، انصاف اور ایمانداری سکھائی ہے۔ ہم ان شاندار روایات اور تصوّرات کے وارث ہوتے ہوئے آئین مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ پاکستان کسی صورت میں بھی کوئی دینی یا ملّائیت کی طرز کی ریاست نہیں ہوگی۔ جہاں ملاؤں کی حکمرانی ہو اور جو اپنے آپ کو دین کے ٹھیکیدار سمجھیں۔ ہمارے ہاں غیر مسلم ہیں، ہندو ہیں، عیسائی ہیں، پارسی ہیں۔ سب کے حقوق برابر ہیں اور پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے سب ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں گے۔ ''

یہ اہم اقتباس ایک ریڈیو پر نشر کی گئی تقریر کا ہے۔ جو فروری ۱۹۴۸ء میں قائد اعظمؒ نے خود کی اور اس کا حوالہ دینے سے میری مراد یہ ہے کہ آئین کے اصول جو ان کے ذہن میں تھے واضح کر دیئے جائیں۔ آئین قوم کے لئے ایک سمت کا تعین کرتا ہے، مل کر رہنے کی راہ ہموار کرتا ہے، حکومت بنانے اور حکومت کرنے کے انداز سکھاتا ہے، اعلیٰ اقدار کی نشاندہی کرتا اور ان کو پروان چڑھاتا ہے۔ بلاشبہ آئین ہی قومیّت کی اساس ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ قائد اعظمؒ کے ان تصوّرات کو ان کے وارثان نے کس طور پر عملی جامہ پہنایا اور کیسے اسی آئین کے تقدّس کو پامال کیا۔ خصوصاً انہوں نے جو بنوک شمشیر اقتدار میں آئے۔

۷ مارچ ۱۹۴۹ء کو پہلی دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد کا ریزولیوشن پاس کیا جسے بجا طور پر پاکستان کی اساس کہا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے آئین کا تاریخی مطالعہ اس ریزولیوشن کے متن سے شروع ہونا چاہئے۔ چنانچہ اس ریزولیوشن سے اقتباس ذیل میں درج کرتا ہوں۔

> ''خدائے بزرگ و برتر کے نام سے، جو رحیم اور کریم ہے اور جس کی حکمرانی کل کائنات پر ہے۔ اس خدا نے ہمیں یہ ملک پاکستان عطا فرمایا ہے کہ ہم اس کی قائم

کردہ حدود میں رہ کر عوام کے ذریعے اس کی حکومت کا نظام قائم کریں۔
یہ قانون ساز اسمبلی، عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے فیصلہ کرتی ہے کہ ایک
آزاد اور خود مختار ریاست پاکستان کے لئے ایک آئین مرتب کرے۔

(۱) جس کے ذریعے سے اسلام کے اصول جمہوریت، آزادی، مساوات، بردباری اور معاشرتی انصاف قائم ہوں۔

(۲) جہاں مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔

(۳) جہاں اقلیتیں اپنے اپنے مذہب اور رواج آزادی سے اپنائیں اور اپنی ثقافت کو ترقی دیں۔

(۴) جہاں تمام علاقہ جو اس وقت پاکستان کا حصہ ہیں، بشمول ان علاقہ جات کے جو بعد میں اس ملک میں آئیں یا اس کے ساتھ الحاق کریں۔ ان میں وفاقی طرز حکومت قائم ہو اور مختلف علاقہ جات اپنی اپنی جگہ اس حد تک خود مختار ہوں جس پر متفقہ فیصلہ ہو۔

(۵) جہاں اقلیتوں کے مفادات کی مکمل حفاظت ہو اور پس ماندہ علاقوں کی تعمیر و ترقی کا خاص انتظام ہو۔

(۶) جہاں عدلیہ کی مکمل آزادی کی ضمانت ہو۔

(۷) جہاں ملک کی سلامتی، سالمیت اور آزادی کا مکمل تحفظ ہو۔ تاکہ پاکستان کے شہری خوشحال ہوں اور دنیا میں اپنا صحیح، باوقار مقام حاصل کرسکیں، اور عالمی امن، ترقی اور خوشحالی کے لئے اپنا کردار ادا کرسکیں۔

قارئین خط کشیدہ شقوں کو خاص طور پر ذہن میں رکھیں۔ خصوصاً ان کی جمہوری اقدار اور ملکی سلامتی کی نسبت سے کہ بعد میں آنے والے آئین یا غیر آئینی دور حکومت کی اپنی اقدار سے موازنہ کرنے میں آسانی ہو۔

۱۹۵۶ء کا آئین

مختلف وجوہات کی بنیاد پر، جو اس مضمون میں زیر بحث نہیں ہیں، پاکستان کا آئین بننے میں نو سال کا عرصہ لگ گیا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کے دن اس آئین کے نفاذ سے پاکستان ایک جمہوری ریاست ری پبلک بن گیا اور باقاعدہ طور پر برطانیہ کی ماتحتی DOMINIAN STATUS سے آزاد

ہو گیا۔ گورنر جنرل' جو تاج برطانیہ کا نمائندہ ہوتا تھا باقاعدہ صدر ریاست مقرر ہوا۔

اس آئین کے مطابق ایک وفاقی پارلیمانی حکومت قائم ہوئی جس میں مقننہ' عدلیہ اور انتظامیہ کے کردار واضح کر دیئے گئے۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے اختیارات کی الگ الگ فہرستیں بن گئیں۔ ایک فہرست ایسی بھی بنی جو مشترکہ تھی۔ پاکستان کی شہریت وفاقی بنیاد پر مقرر ہوئی اور صوبوں کی الگ الگ شہریت کی کوئی شق نہیں رکھی گئی۔ ہر بالغ شخص کو حق رائے دہی دیا گیا اور اسمبلیوں کی مدت معیاد پانچ سال رکھی گئی۔ ملک کی جغرافیائی صورت کے مدنظر صوبائی حکومتوں کو بہت سی خود مختاری دی۔ حسین شہید سہروردی کے الفاظ میں ۹۸ فی صد، غرضیکہ یہ ایک قرار واقعی جمہوری آئین تھا جس کا مقصد تھا کہ ملک میں اسلامی اقدار پر مبنی سیاسی عمل جاری ہو' نمائندہ حکومتیں بنیں' حکمرانوں کے محاسبے کے اصول وضع ہوں۔ لہٰذا گو اس آئین کو وضع ہونے میں تاخیر ہوئی لیکن یہ عوام کی امنگوں پر پورا اترتا تھا اور ملک کے دونوں حصوں' یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان میں یکساں مقبول تھا۔

ہر ملک کا آئین اس کے باشندوں کے لئے مقدس ہوتا ہے۔ جب حکومتیں بنتی ہیں یا اعلیٰ ترین عہدیدار اپنے منصب پر تعینات ہوتے ہیں تو سب کے سب اسی آئین کی برتری کا اقرار کرتے ہیں اور اسکے تحفظ اور اطاعت کا حلف اٹھاتے ہیں۔ آئین کی خلاف ورزی جرم اور اس کے خلاف سازشیں بغاوت سے تعبیر کئے جاتے ہیں اور ایسی بغاوت کی سنگین ترین سزا مقرر ہے۔ یہ قانون کسی ایک ملک کا نہیں' دنیا بھر کے مہذب ممالک میں نافذ ہے اور پھر اسلام کے پیروؤں سے زیادہ مہذب اور کون ہو سکتا ہے کہ یہ اسلام ہی ہے جس نے بنی نوع انسان کو تہذیب' محبت' اخوت اور انسان دوستی کا سبق سکھایا۔ بدقسمتی سے پاکستان میں ہماری افواج' بلکہ افواج کے چند سربراہ جرنیلوں نے ہمارے آئین کے تحفظ اور اطاعت کا حلف اٹھانے کے بعد اسے کچلا' معطل کیا' بدلا اور متعدد بار بالکل منسوخ کر دیا۔ آئین کے ساتھ یہ سلوک اسی معاشرے میں ہو سکتا ہے جو سیاسی اور اخلاقی ضمیر سے بے بہرہ ہو یا پھر جہاں عوام کو بندوق کی نالی کے سامنے رکھ کر بے بس کر دیا جائے۔

۱۹۵۶ء کے آئین کے نفاذ سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور انڈین انڈی پینڈنس ایکٹ ۱۹۴۷ء جن کے ماتحت عارضی طور پر حکومت کا کاروبار چل رہا تھا' خود بخود کالعدم ہو گئے۔ اور ایک مستقل نظام' یا کم از کم جسے عوام ایک مستقل نظام سمجھتے تھے۔ معرض وجود میں آ گیا۔ جب ۱۹۵۹ء کے اوائل میں ہونے والے جنرل الیکشن کا اعلان ہوا تو ملک میں سیاسی عمل جاری ہو گیا کہ عوام اپنے نمائندوں کے ذریعے حکومت کے کاروبار میں شریک ہونے پر شاداں وفرحاں تھے۔ تاخیر تو خیر ہوئی لیکن لوگ اسی نظام کے تحت اجتماعی زندگی کے متمنی تھے۔ یہ اس خواب کی تعبیر تھی جو برِّصغیر کے مسلمانوں نے دیکھا اور جس کی خاطر لاکھوں جانیں قربان ہوئیں۔ مصائب کے پہاڑ ٹوٹے اور پھر جا کر کہیں یہ دن آیا۔

لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔ جنرل محمد ایوب خان ، کمانڈر انچیف پاکستان آرمی نے ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں مارشل لاء لگادیا۔ واضح رہے کہ ملک میں کسی قسم کی بد امنی ، کوئی ہنگامی صورت یا آئینی بحران نہیں تھا جس کی بنا پر فوج مداخلت کرتی۔

۱۹۵۸ء میں اقتدار پر فوجی قبضہ

آئین سے پہلے کا عارضی حکومتوں کا سلسلہ اور سیاسی استحکام کا فقدان ختم ہوچکا تھا۔ لوگ خوش تھے کہ بالآخر وہ جمہوریت کی دہلیز پر قدم رکھ رہے تھے۔ سیاسی جماعتیں اپنی صفیں درست کرنے میں اور الیکشن کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ ان حالات میں مارشل لاء لگانے کا کوئی قانونی یا اخلاقی جواز تو ہرگز نہیں تھا البتہ یہ حقیقت ضرور تھی کہ ۱۹۵۹ء میں الیکشن ہوجانے پر سکندر مرزا کی بطور صدر پاکستان حکمرانی ختم ہوجاتی اور اس کے ساتھ ساتھ ایوب خان کی سازش کی کھچڑی جو اندر ہی اندر برسوں سے پک رہی تھی ، دھری کی دھری رہ جاتی۔ سکندر مرزا جو اپنے آپ کو سازش ، دھوکہ دہی ، گٹھ جوڑ اور دغابازی میں استاد کامل سمجھتا تھا اس گمان میں تھا کہ وہ پاکستانی فوج اور اس کے جرنیلوں کو استعمال کر کے اپنا اقتدار قائم رکھے گا۔ لیکن یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہوگئی کیونکہ کچھ اسی قسم کی چال ایوب خان نے بھی سوچ رکھی تھی۔ وہ ایک عرصہ دراز سے ملک کی سیاست کا گہرا مطالعہ کر رہا تھا۔ مختلف حکومتوں سے تعلقات استوار رکھتا تھا تاکہ اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی مدت ملازمت میں توسیع ہوتی رہے۔ سول افسروں سے اکثر ملاقاتیں ہوتی تھیں ، یہ جاننے کے لئے کہ کون کون دشواریاں پیدا کر سکتے ہیں اور کون ایسے ہیں جن کو ترقی کا لقمہ دے کر رام کیا جاسکتا ہے۔ سیاسی لیڈروں کی بھی کچھ ایسی ہی جانچ پڑتال کر رکھی تھی۔ بیرون ملک بھی اچھا تاثر پیدا کر رکھا تھا۔ اور مناسب جگہوں پر دوست بنا رکھے تھے تاکہ وقت آنے پر ان کی مدد میسر آسکے۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں فوجی اقتدار کے ساتھ ہی آئین منسوخ کردیا گیا اور ملک میں آمریت کا دور شروع ہوا۔ عاصمہ جیلانی بنام سرکار کے مشہور مقدمے کے فیصلے میں سپریم کورٹ نے ڈوسو DOSSO کیس کا حوالہ دیتے ہوئے ایوب خان کے مارشل لاء کے متعلق لکھا ہے۔

> جیسا کہ ایک مبصر نے کہا ہے ' ایک معقول ملک کو دنیا کے لئے تمسخر کا نشانہ بنا دیا۔ ایک ایسا ملک جو ایک تحریری آئین کے تحت معرض وجود میں آیا ' جس آئین میں مقننہ ' عدلیہ اور انتظامیہ کے اختیارات وضاحت سے تقسیم کر دئے گئے تھے۔ ایک آمرانہ نظام میں بدل گیا اور پھر فوجی ڈکٹیٹر شپ کا شکار ہوا۔ اس کے بعد عوام جو خدائے بزرگ و برتر کے عطا کردہ اقتدار کے وارث تھے ، حکومت کے نظام اور بست و کشاد سے الگ کر دئے گئے اور ان تمام تر طاقت کا حامل ایک آمر ان پر اس طرح حکومت کر رہا ہے جیسے کوئی غیر ملکی فاتح جرنیل شکست خوردہ رعایا پر کرتا ہے۔

۱۹۶۲ء کا آئین

۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو ایوب خان نے سابقہ چیف جسٹس، مسٹر جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک آئینی کمیشن قائم کیا۔ مسٹر جسٹس شہاب الدین ایک نہایت دیانت دار اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک جج تھے۔ ملک کے دونوں حصوں، یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان میں ان کو عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود ایوب خان نے ان کی حُب الوطنی اور خلوص کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ ان خدمات میں شہاب الدین کا مقام بہت بلند ہے۔ شہاب الدین نے آئینی کمیشن کی سربراہی اس شرط پر قبول کی تھی کہ ان کے کام میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی اور ان کی رپورٹ قبول ہو یا نہ ہو، شائع ضرور کی جائے گی۔

کمیشن نے ایک طویل سوالنامہ شائع کیا اور ملک کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے انٹرویو کئے۔ خصوصاً ان لیڈران سے جن کا براہ راست عوام سے رابطہ اور تعلق تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، پختہ کار اور منجھے ہوئے سیاستدان جن میں نور الامین، عطا الرحمٰن، چوہدری محمد علی وغیرہ شامل تھے، سامنے آئے اور انہوں نے آئین پر رائے دینے سے پہلے آئین کی منسوخی اور مارشل لاء کے نفاذ کو چیلنج کیا۔ انہوں نے واضح الفاظ میں کہا کہ سکندر مرزا کو نوشتہ دیوار نظر آ رہا تھا کہ جونہی الیکشن ہوئے اس کو اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑیں گے لہٰذا اس نے مارشل لاء لگایا۔ انہوں نے مزید کہا کہ مارشل لاء کا ٹولہ خواہ کچھ بھی کہے اور سیاستدانوں پر کیچڑ اُچھالے لیکن اس حقیقت کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ ملک میں جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔

جہاں تک نئے آئین کا تعلق تھا سب نے یک زبان ہو کر جمہوری آئین کی حمایت کی۔ مختلف طبقات کے لوگوں سے ان کی آراء اور نظریات جمع کر کے کمیشن نے مئی ۱۹۶۱ء میں ایوب خان کو نئے آئین کا مجوزہ ڈرافٹ پیش کر دیا۔ اس ڈرافٹ میں وفاقی طرز حکومت، مقننہ اور عدلیہ کی مکمل خود مختاری اور آزادی کی سفارش کی گئی۔ عوام کے بنیادی حقوق پر زور دیا گیا وفاق اور صوبائی اسمبلیوں کے لئے مناسب مالیاتی اختیارات تجویز ہوئے۔ البتہ ان سب سفارشات کے ساتھ صدارتی نظام بھی تجویز کیا گیا۔ عطا الرحمٰن نے اس کے بارے میں یہ کہا کہ چونکہ ملک دو حصوں میں بٹا ہوا ہے اور دونوں حصوں کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے اس لئے صدارتی نظام ہمارے لئے ناقابل عمل ہے۔ ہونا یہ چاہئے کہ جب صدر ایک حصے سے تعلق رکھتا ہو تو وزیر اعظم دوسرے حصے سے چنا جائے۔ صدارتی نظام میں لامحالہ ایک حصہ اپنے آپ کو اقتدار اعلیٰ سے الگ پائے گا۔ جو اس حصے کے عوام کی دل شکنی کا باعث ہو گا۔ عوام، جس سے مراد تمام ملک کے عوام ہیں، اقتدار میں شریک نہ ہوں تو جمہوریت ایک ڈھونگ رہ جاتی ہے اور حکومت مؤثر اور فعال نہیں ہو سکتی۔ آئینی کمیشن نے صدارتی نظام حکومت کی سفارش تو کی لیکن ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا کہ پاکستان کے عوام کا پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنے حکمران خود چنیں

اور اپنی ضروریات و ترجیحات کے مطابق قومی پالیسی کی تشکیل کریں۔ لارڈ ایکٹن LORD ACTON کا مشہور مقولہ ہے۔ POWER CORRUPTS AND ABSOLUTE POWER CORRUPTS ABSOLUTELY

طاقت اور اختیار یا اقتدار۔ انسان کو بد دیانت بنا دیتے ہیں اور جہاں یہ طاقت ہمہ گیر اور کسی قسم کے محاسبے سے آزاد ہو وہاں بد دیانتی بھی ہمہ گیر اور آزادانہ ہو جاتی ہے۔

کمیشن نے یہ مقولہ دہراتے ہوئے حتمی طور پر ہر قسم کی آمریت کی مخالفت کی اور کہا کہ پاکستان میں صرف اور صرف نمائندہ حکومت ہی ہونی چاہئے۔

کمیشن کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ جمہوریت کی بو آ رہی تھی لہٰذا ایوب خان نے بلا تامل اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا صرف ایک سفارش جو منظور کی گئی وہ تھی صدارتی نظام کی۔ جسٹس شہاب الدین سے رپورٹ شائع کرنے کے وعدے سے بھی انحراف کیا گیا اور عوام کو اس کی باقی سفارشات کے متعلق اندھیرے میں رکھا گیا۔ البتہ جسٹس شہاب الدین کی اشک شوئی کے لئے ملک کا سب سے بڑا سول ایوارڈ انکو دینے کی کوشش کی گئی جسے موصوف نے پہلے سے انکار کر کے اپنے با اصول اور باوقار انسان ہونے کا ثبوت دیا

شہاب الدین لاہور میں رہا کرتے تھے۔ سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس ہونے کی حیثیت سے گورنر ہاؤس کی تمام تقاریب میں بلائے جانے والے شرفا میں ان کا نام سرفہرست تھا۔ لیکن اس واقعہ کے بعد انہوں نے گورنر پنجاب سے درخواست کی کہ اس فہرست سے ان کا نام خارج کر دیا جائے۔ اور آئندہ انہیں کبھی کسی سرکاری یا غیر سرکاری دعوت یا تقریب میں نہ بلایا جائے۔

ایوب خان نے کسی عوامی رد عمل کی پرواہ کئے بغیر آئینی کمیشن کی رپورٹ کو رّد کر دیا اور اپنے مخصوص فلسفے یا مفاد کے مطابق ایک نئے آئین کا مسودہ تیار کروایا۔ اس نئے آئین کے اہم نکات مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ وفاقی حکومت جو صدارتی نظام کے تحت ہوگی۔

۲۔ مرکز میں ایک ہی قومی اسمبلی ہوگی اور اسی طرح دونوں صوبوں میں ایک ایک صوبائی اسمبلی ہوگی۔

۳۔ تمام اسمبلیاں یک ایوانی UNI CAMERAL ہوں گی۔

۴۔ وفاق کے تمام انتظامی اختیارات صدر کو تفویض ہوں گے۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی کابینہ کے ارکان نامزد کرے گا۔ یہ ضروری نہیں ہوگا کہ ارکان کابینہ عوام کے منتخب نمائندے ہوں۔ وزرا صرف صدر کو جوابدہ ہوں گے اور قومی اسمبلی کو جوابدہ نہیں ہوں گے۔

۵۔ قومی اسمبلی صدر کو اس کے عہدے سے ہٹا نہیں سکے گی اور نہ ہی صدر قومی اسمبلی کو جوابدہ ہوگا۔

۶۔ صوبائی گورنر صدر ہی کے نامزد ہوں گے اور وہ بھی صوبائی اسمبلیوں کو جواب دہ نہیں ہوں گے۔ صوبائی گورنر بھی اپنی کابینہ خود ہی نامزد کریں گے۔

۷۔ صدر اور اسمبلیوں کے انتخابات بالواسطہ ہوں گے۔ پہلے براہ راست بالغ رائے دہی سے ۸۰،۰۰۰ ممبران بنیادی جمہوریت منتخب ہوں گے اور پھر یہ ممبران صدر اور ارکان اسمبلی کا انتخاب کریں گے۔

۸۔ صدر کے عہدے کے لئے صرف تین امیدوار کھڑے ہو سکیں گے۔

۹۔ قومی اسمبلی میں صدر اور صوبائی اسمبلیوں میں گورنروں کی اجازت کے بغیر کوئی نظر بندی کا بل یا اس کی ترمیم پیش نہیں ہو سکے گی۔

۱۰۔ اگر قومی اسمبلی کے پاس کئے ہوئے بل کو صدر نامنظور کر دے تو یہ بل قومی اسمبلی کو دوبار غور کرنے کے لئے لوٹا دیا جائے گا۔

۱۱۔ بجٹ منظور کرنے کے تمام اختیارات صدر کے پاس ہوں گے اور اسمبلی کا اس ضمن میں کوئی اختیار نہیں ہو گا۔

۱۲۔ عوام کے بنیادی حقوق کا ذکر تو اس آئینی مسودے میں تھا لیکن ان حقوق کے نفاذ کے لئے عدلیہ کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا۔

۱۳۔ آئین سیاسی جماعتوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔

میں نے ایوب خانی آئین کے اہم نکات کا تفصیل سے ذکر اس لئے کیا ہے کہ اس کی ساخت صریحاً آمرانہ تھی، اختیارات صدر کے ہاتھ میں تھے اور منتخب اسمبلیاں ربڑ کی مہریں تھیں۔ ایک منتخب اسمبلی کی سب سے بڑی طاقت یہ ہوتی ہے کہ انتظامیہ اس کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ چونکہ وفاقی اور صوبائی وزراء جو مختلف محکموں کے سربراہ تھے، اسمبلیوں کے سامنے جوابدہ نہیں تھے اور فقط صدر اور گورنروں کو ہی جوابدہ تھے، تمام طاقت اور اختیار صدر اور اس کے نامزد گورنروں میں ہی مرکوز ہو کر رہ گئے تھے اور نام نہاد اسمبلیاں قطعی بے معنی اور بے اثر ہو گئی تھیں۔

منتخب اسمبلی کا دوسرا اختیار جو اسے انتظامیہ کی نوک پلک درست کرنے کا موقع دیتا ہے، وہ بجٹ پر بحث اور اس کی منظوری ہے۔ اسمبلیوں کو اس اختیار سے بھی محروم رکھا گیا۔

اس پہ طرّہ یہ کہ اس آئین کے مطابق نظام حکومت میں سے سیاست اور سیاستدانوں کو ایسے نکال پھینکا جیسے دودھ میں سے مکھی۔ ایوب خان برابر یہی دہراتے تھے کہ سیاستدانوں نے ملک کو تباہی کے کنارے

پرلا کھڑا کیا تھا اور اُن کا مصمم ارادہ تھا کہ وہ سیاست اور سیاستدانوں کو سرے سے ہی ختم کر کے دم لیں گے۔ دنیا کے ممالک میں پانچویں بڑے ملک کے خود ساختہ صدر کی زبان سے ایسے مضحکہ خیز خیالات کا اظہار اُن کی اپنی فراست کا آئینہ ہے۔

بریں عقل و دانش بباید گریست ؎

یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو یہ مسودہ جوں کا توں آئین کی شکل میں نافذ ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسا آئین لوگوں کو قابل قبول نہ تھا لیکن لوگوں کی پرواہ تھی کس کو۔ پریس پر کڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس جاری ہو گیا اور ذرائع ابلاغ کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ دفعہ ۱۴۴ ضابطۂ فوجداری جو صرف ہنگامی حالات میں وقتی طور پر کسی محدود علاقے میں نافذ کی جاتی ہے، لمبے عرصے کے لئے اور تمام بڑے شہروں میں لگا دی گئی تاکہ عوام جلسے جلوسوں اور تقریروں سے ایسے آئین پر کوئی تبصرہ یا تنقید نہ کر سکیں۔ تحریر، اجتماع اور تقریر پر اس طرح پابندی لگ جانے سے عوام دل برداشتہ ہو گئے لیکن توپ اور تفنگ کے سامنے بے دست و پا ہو کر کچھ نہ کر سکے۔ اپنے گریبان کا پرچم لے کر نکلنے والا رند حبیب جالب پکار اٹھا۔ ؎

ایسے دستور کو
صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا
میں نہیں جانتا

تو وہ برسوں جیل میں سڑتا رہا۔

ادھر قومی اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے ایوب نے تنبیہ کی

"قومی اسمبلی کو وجود میں لانے کا مقصد ہر گز یہ نہیں ہے کہ یہ آئین پر تنقید کرنے لگے یا اس میں ترامیم کا سلسلہ جاری ہو۔ اسمبلی کا فرض ہے کہ وہ آئین کو تحفظ دے اور اس کا دفاع کرے۔"

بایں ہمہ رفتہ رفتہ لوگوں کو کچھ کہنے سننے کا یارا ہوا تو ۲۴ جون ۱۹۶۲ء کو نو بنگالی لیڈروں نے، جن میں شیخ مجیب الرحمان بھی شامل تھا، آئین کی قطعی آمرانہ حیثیت پر تنقید کی اور یہ اعتراض بھی کیا کہ

"اسے عوام کی حمایت حاصل نہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بغیر معقول ترامیم کے یہ آئین ناقابل عمل ہو گا۔"

ایوب خان کو کئی بار سمجھانے کی کوشش کی گئی کہ نہ صرف بطور تھیوری کے بلکہ عملاً بھی یہ کہنا یا سوچنا کہ آئندہ کاروبار ریاست میں نہ سیاست کو دخل ہو ۔۔ اور نہ سیاستدانوں کو ایک قطعی مہمل اور بے معنی بات ہے۔ آخر کار حکومت کرنا بھی سیاست ہے 'انتخاب اور منتخب نمائندوں کا اسمبلیوں میں بیٹھنا اور قانون وضع کرنا بھی سیاست ہے' ہر وہ شخص جو منتخب ہوا یا ہار ا یا جو انتخاب میں شامل نہ ہوا یا باز رکھا گیا' سب سیاستدان ہیں۔ انہیں خواہ کوئی بھی نام دے دیا جائے' عرف عام میں سیاستدان ہی کہلائیں گے۔ پھر خواہ مخواہ کی قید و بند لگا کر یہ دعویٰ کرنا کہ ہم ایک آزاد معاشرہ ہیں مضحکہ خیز بات ہے۔ لیکن ایوب خان پہلے تو اپنی بات پر اڑے رہے "دیوانہ بکار خویش ہشیار" اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ عوام میں مقبول سیاسی لیڈر ان کے مقابل نہ بن سکیں۔ اس لئے اگر ان کو اور سرے سے سیاست ہی کو بدنام کر کے عوام کی سوچ کے دھارے موڑ دئے جائیں تو پھر راج کرے گا خالصہ جب باقی رہے نہ کوئی۔ لیکن بدقسمتی سے یہ ہو نہ سکا۔ ۔ ایوب خان کے اپنے خاص حامی ممبران اسمبلی بکھرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ ایوب نے ان کی "ہم خیال" گروپ بندی کرنے کی کوشش کی پھر بھی بات نہ بنی اور یہی حامی ممبران تقاضا کرنے لگے کہ سیاسی پارٹیاں بحال کی جائیں۔ ان کا مؤقف تھا اور درست مؤقف تھا کہ صدارتی نظام میں تو خود صدر کو اکثریتی پارٹی کا رکن ہونا لازمی ہے ورنہ اس کا بغیر اکثریت اس عہدے پر فائز رہنا نہ مناسب ہے نہ ممکن۔

سرکاری ملازمان' پرانے سیاستدانوں اور اپنے حامی ممبران اسمبلی سے مفصل بحث مباحثے کے بعد بالآخر ایوب خان نے دیکھ لیا کہ سیاست کے ٹھہرائے ہوئے اصولوں سے انحراف ممکن نہیں اور نہ ہی سیاسی پارٹی کے بغیر اس کی اپنی حکومت قائم رہ سکتی ہے۔ چنانچہ اس کی نظر انتخاب مسلم لیگ پر پڑی کیونکہ ملک کی آزادی کی ذمہ دار یہی پارٹی تھی اور عوام میں اس کا امیج بہت عظیم تھا۔ اس جماعت کی لیڈر شپ سے نواب کالاباغ کے گہرے اختلافات تھے لہٰذا اس نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ یا تو کوئی اور پارٹی چن لی جائے یا پھر نئے سرے سے اپنی الگ پارٹی بنالی جائے۔ لیکن ایوب خان مسلم لیگ کے نام اور شہرت سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے اصرار کیا جس پر نواب کالاباغ نے "مکمل انتظامات" کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ پارٹی کے سیکرٹری کو راولپنڈی بلا کر ایک شاندار مہمان خانے میں رکھا گیا۔ نواب کالاباغ کی ہدایات کے مطابق وفاقی وزیر شیخ خورشید احمد اس سے ملا اور تین دن تک ایک خاص قسم کے سمجھوتے پر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ سیکرٹری مسلم لیگ کسی طور راضی نہ ہوا۔ تیسرے دن جب اس نے مہمان خانے سے رخصت ہونے کی کوشش کی تو مہمان خانے پر متعین گارڈ کے ایک سپاہی نے بصد احترام اسے اطلاع دی کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا جب تک کہ وزیر باتدبیر کا حکم نہ ہو۔ بیچارا سیکرٹری بے بس ہو گیا اور اس پابندی کے کچھ ہی عرصہ بعد اس نے ایک اعلان پر دستخط کر دیئے جس کی رو سے وہ اور اس کے تمام ہم خیال ممبران پارٹی نے اپنی الگ مسلم لیگ بنالی۔ چنانچہ مسلم لیگ کے اس گروپ نے ایوب خان کو اپنا صدر بنالیا

اور ایوب خان خود ہی نہ صرف ایک سیاستدان بن گئے بلکہ ملک کی سب سے بڑی پارٹی کا صدر بھی ۔

آنچہ دانا کند، کند ناداں لیک بعد از خرابی بسیار

۱۹۵۹ء میں ایوب خان نے بنیادی جمہوریت BASIC DEMOCRACY کا نظام رائج کیا۔ اس نظام کی بنیاد یہ تھی کہ پاکستان کے عوام سیاسی طور پر جاہل ہیں اور ووٹ کے تقدس کو نہیں پہچانتے۔ لہٰذا ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ مقامی طور پر الیکشن میں حصہ لے کر بنیادی جمہوریت کے ممبران کا انتخاب کریں اور یہ منتخب ممبران صدر اور اسمبلی کے انتخاب کے لئے ووٹ ڈالنے کے اہل ہوں۔ جن لوگوں نے ہندو اکثریت اور انگریزی اقتدار کی مسلسل مخالفت کے باوجود ایک نیا اور آزاد ملک بنا ڈالا ان کے متعلق یہ کہنا کہ انہیں سیاسی شعور نہیں یا وہ براہ راست ووٹ کے حقدار نہیں ایک ایسی الزام تراشی ہے جو سراسر بدنیتی پر مبنی ہے۔

مزید بر آں عوام کو کوئی حق دینا ترقی کہلاتا ہے۔ ان سے وہ حق چھین لینا جسے وہ برسوں سے استعمال کرتے چلے آرہے ہوں آزادی اور ترقی کی نفی ہے۔ ایوب خان اس بات سے بخوبی واقف تھا لیکن اس نے ملک میں مارشل لاء اس لئے نہیں لگایا تھا کہ سیاسی عمل اور سیاسی اداروں کو فروغ ملے۔ اس کا تو صاف اور واضح مقصد یہی تھا کہ فوج کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرے اور پھر عمر بھر ڈٹ کر حکومت کرے۔

چنانچہ یہ جانتے ہوئے کہ بنیادی جمہوریت کا نظام ایک ڈھونگ اور رجعت پسند اقدام تھا ایوب خان نے اسے نافذ کیا تاکہ مارشل لاء اٹھا لینے کے بعد وہ خود بار بار منتخب ہو کر صدر کے عہدے پر متمکن رہے۔ براہ راست ووٹ کے ذریعے عام انتخابات میں کوئی امیدوار سو فی صد یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کامیاب ہو گا۔ ہر امیدوار اپنے ماضی کے کردار اور سیاسی یا سماجی کارکردگی پر انحصار کرتے ہوئے عوام کے پاس جاتا اور ان کے ووٹ کا طالب ہوتا ہے۔ ایک مارشل لاء لگانے والا جرنیل جس نے ایک قانونی حکومت کو بزور شمشیر معزول کر دیا ہو، سیاسی عمل موقوف اور بنیادی حقوق سلب کر لئے ہوں۔ جس نے چھوٹے چھوٹے جرائم یا ادنیٰ سی مخالفت پر لوگوں کو کڑی سزائیں دی ہوں۔ الغرض جس نے ملک اور قوم کا گلا دبوچ رکھا ہو، ایسے جرنیل کا عام انتخابات میں ایک عام امیدوار کی حیثیت سے کامیابی کی امید رکھنا عبث ہے۔ لیکن اگر انتخابات بالواسطہ ہوں اور ووٹ ڈالنے والوں ELECTORAL COLLEGE کی تعداد مختصر سی ہو، جن پر اثرانداز ہونا یا دوسرے لفظوں میں جن کو خرید لینا آسان ہو تو پھر کامیابی کا کافی امکان ہے۔ بنیادی جمہوریت اسی کرشمے کا نام تھا۔ بنیادی جمہوریت کے ممبران کو نام نہاد مقامی ترقی و تعمیر کے لئے بے بہا روپیہ دیا گیا۔ یہ روپیہ سب کا سب نہیں تو اس کا بیشتر حصہ ممبران خورد برد کر لیتے تھے۔ صدر کے الیکشن ہو جانے کے بعد مزید رقوم کا لالچ دیا جاتا تھا۔ اگر کوئی ممبر مخالفت کی جرأت کرتا تھا

تو فوراً اس کو محاسبے کی دھمکی دی جاتی تھی تا آنکہ وہ سیدھی راہ پر آجائے۔ لہٰذا یہ نظام صریحاً ایک دھوکہ تھا جس کا مقصد ایک اقتدار کے بھوکے آمر کے لیے تاعمر صدارت کی کرسی کی ہوس کو پورا کرنا تھا۔

۷ جون ۱۹۶۲ء کو مارشل لاء اٹھا لیا گیا۔ لیکن اس اقدام سے پہلے ایوب خان نے ایک مہمل سے ریفرنڈم کے ذریعے خود کو ملک کا صدر بنوالیا ہوا تھا۔ نئے آئین کے تحت قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی تشکیل ہوئی۔ ۱۹۶۵ء میں ایوب خان کی صدارت کی مدت ختم ہونی تھی لہٰذا صدارتی اور پارلیمانی انتخابات کا اعلان ہوا۔ حزب مخالف کو نظر آرہا تھا کہ الیکشن ایک ڈھونگ ہوگا۔ لہٰذا انہوں نے مطالبہ کیا کہ کم از کم صدارتی انتخاب تو براہ راست ہو۔ یہ مطالبہ ایوب کو کسی صورت میں منظور نہیں تھا کیونکہ آئین سازی اور بنیادی جمہوریت کا سارا تماشا تو تھا ہی اس ایک انتخاب میں کامیابی کا راز۔ لہٰذا ایوب نے یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ حزب اختلاف مشکل میں تھی کہ ایسے حالات میں ایوب کے خلاف مؤثر امیدوار کون ہو سکتا ہے، خصوصاً جب کہ ساری کی ساری انتظامیہ ایوب کے حق میں خون پسینہ ایک کر رہی تھی۔ بالآخر انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ فاطمہ جناح سے درخواست کی کہ وہ ایوب خان کے خلاف صدارتی امیدوار بنیں۔ پہلے تو ایوب خان نے اس مقابلے کا مذاق اڑایا اور یہی سمجھا کہ فاطمہ جناح کے خلاف اس کی کامیابی یقینی ہے۔ چند ملاؤں سے یہ فتویٰ لیا گیا کہ عورت سربراہ مملکت نہیں ہو سکتی۔ اسلام کو ذاتی غرض کے لئے استعمال کرنے کی یہ مثال اس شخص نے قائم کی جو مذہب اور ریاست کے کاروبار کو قطعاً دو الگ شعبے گردانتا تھا۔ جب الیکشن کی مہم زوروں پر آئی تو ایوب خان یہ دیکھ کر بوکھلا گئے کہ محترمہ فاطمہ جناح کی کامیابی نوشتہ دیوار ہے۔ ہوا یہ کہ پہلی بنیادی جمہوریت کے انتخابات کے برعکس دوسرے انتخابات میں زیادہ آزاد اور منچلے لوگ منتخب ہوگئے تھے یہ انتخاب بھی صدارتی انتخاب سے تھوڑی دیر پہلے ہوا تھا۔ لہٰذا انتظامیہ کو ان نئے ممبران یعنی ELECTORAL COLLEGE کو رام کرنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ بالآخر دھونس اور دھاندلی کے ذریعے کامیابی ایوب خان ہی کی ہوئی جو پاکستان کے ہر ذی شعور شہری کے لئے انتہائی حیرت کا باعث بنی۔

۱۹۵۶ء کے آئین میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ لکھا گیا تھا۔ ایوب کے آئین میں سے لفظ "اسلامی" حذف کر دیا گیا لیکن اسمبلیوں کے اصرار پر اس لفظ کو ایزاد کیا گیا اور ملک دوبارہ اسلامی جمہوریہ کہلانے لگا۔

وزیر قانون شیخ خورشید احمد کی ذاتی کاوش سے ایوب خان نے بنیادی حقوق کے نفاذ کے اختیارات عدلیہ کو بحال کر دیئے۔

آئین کی شق نمبر ۱۰۳ کے تحت اگر کوئی ممبر اسمبلی وزیر چن لیا جاتا تھا تو اس کو اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دینا پڑتا تھا تاکہ وہ اسمبلی کے سامنے جواب دہ نہ رہے۔

آئین کے نافذ ہونے کے چار دن کے اندر ہی ایوب کو احساس ہوا کہ اسمبلی کا کوئی سرکردہ رکن وزارت کی خاطر اپنی رکنیت چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ آخر کار اسمبلی کی رکنیت کا ایک عرصہ متعین تھا لیکن وزارت صرف صدر کی خوشنودی پر موقوف تھی اور بغیر وجہ کے بھی چھین لی جا سکتی تھی۔ چنانچہ آئین کی اس شق میں بھی ترمیم کر دی گئی تاکہ وزرا اسمبلیوں کی رکنیت سے سبکدوش نہ ہوں۔ لیکن یہ ترمیم قائم نہ رہ سکی کیونکہ سپریم کورٹ نے اسے غیر مؤثر قرار دے دیا۔

جب ایوب نے دیکھا کہ مارشل لاء کا لبادہ اُتارنے کے بعد ریاست کا کاروبار سیاست اور سیاسی پارٹیوں کے بغیر چلنا محال ہی نہیں ناممکن ہے تو اس نے ایک نیا قانون بنام پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ نافذ کیا جس کی رو سے سیاسی جماعتوں پر بہت سی پابندیاں لگا دی گئیں۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ پابندیاں ناقابل عمل ہونے کے وجہ سے نظر انداز ہوتی گئیں۔ بہر طور ایوب خان کا سیاسی فلسفہ جس میں ریاست کے کاروبار میں سیاست اور سیاستدانوں کی کوئی جگہ نہ تھی ٹھپ ہو گیا۔ اور وہ آئینی ڈھانچہ جو اس فلسفے کی بنیاد پر بنا تھا ان ترامیم سے شکست و ریخت ہو کر رہ گیا۔

اسمبلیوں کے اختیارات محدود تھے۔ جب کہ صدر ہر طرح کی بالادستی رکھتا تھا۔ اکثر اوقات جب کوئی ایسا قانون بنانا مقصود ہوتا تھا۔ جس پر حزب اختلاف کے شدید ردِ عمل کا خطرہ ہوتا تھا تو یکایک اسمبلی کا اجلاس منسوخ کر دیا جاتا تھا اور قانون آرڈیننس کی شکل میں ایوان صدارت سے جاری ہو جاتا تھا۔ اسمبلی کے آئندہ اجلاس تک قانون کی توثیق کی راہ ہموار کر لی جاتی اور پھر اجلاس میں اسے باقاعدہ قانون کی شکل دے دی جاتی تھی۔

عوام ایوب کے دوبارہ منتخب ہونے کے طریق کار کی وجہ سے دل برداشتہ ہو چکے تھے۔ ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند نے اس کی شخصیت کو اور متنازعہ بنا دیا۔ چنانچہ اس کے آمرانہ طرز حکومت کے خلاف نفرت ہنگاموں کی صورت میں ظاہر ہونا شروع ہو گئی حتیٰ کہ ۱۹۶۹ء میں یہ ہنگامے بے قابو ہو گئے۔ مسٹر الطاف گوہر سیکرٹری اطلاعات سمیت ایک وفد ایوب خان کا پیغام لے کر جنرل یحییٰ خان کے پاس گیا اور اس سے درخواست کی کہ امن بحال کرنے میں تعاون کرے اور مارشل لاء لگانے کا اقدام نہ کرے۔ یحییٰ خان نے اس درخواست پر توجہ نہ دی۔ ۲۴ مارچ ۱۹۶۹ء کو ایوب خان نے یحییٰ خان کو کمانڈر انچیف پاکستان آرمی کو مندرجہ ذیل سرکاری مراسلہ بھیجا۔

> "یہ تمہارا آئینی اور قانونی فریضہ ہے کہ نہ صرف بیرونی حملے کی صورت میں ملک کا دفاع کرو بلکہ اس کو اندرونی خلفشار سے بھی محفوظ رکھو۔ قوم تم سے توقع کرتی ہے کہ اپنے اس فریضے کو بطور احسن سرانجام دو، ملک کی سالمیت کے ساتھ اس کے معاشرتی، اقتصادی اور انتظامی نظام کو بحال کرنے اور برقرار رکھنے میں مدد اور تعاون

کرو۔ آو' اور اس بدحال ملک کے بارہ کروڑ عوام کو امن اور خوشحالی واپس دلاؤ۔ "

اپنے اس خط کا منفی ردِ عمل دیکھ کر ایوب خان نے اگلے روز ہی حکومت سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دیا اور آغا محمد یحییٰ خان نے عنان حکومت سنبھال لیں۔

۱۹۶۲ء کے آئین کی منسوخی

یحییٰ خان نے ملک میں مارشل لاء نافذ کیا' خود صدر اور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کا عہدہ سنبھالا اور ۱۹۶۲ء کا آئین منسوخ کر دیا۔ ایوب خان کی طرح یحییٰ خان نے بھی اس دن کے لئے تیاری کر رکھی تھی۔ اپنے مخصوص اور با اعتبار دوستوں کو ترقیاں دے کر اہم عہدوں پر فائز کر رکھا تھا مختلف اقدامات جو سلسلہ وار انجام پانے تھے پہلے سے تیار تھے۔ لہٰذا فوراً ہی ایک نیا لیگل فریم ورک آرڈر LEGAL FRAMEWORK ORDER جاری ہو گیا جس کی رو سے صوبہ مغربی پاکستان توڑ دیا گیا اور سابقہ صوبہ جات فرنٹیر' پنجاب' بلوچستان اور سندھ میں بحال ہو گئے۔ بنیادی جمہوریت کا نظام منسوخ کر دیا گیا اور براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کا نظام بحال کر دیا گیا۔ اسمبلیوں میں ممبران کی تعداد آبادی کی بنیاد پر مقرر کر دی گئی۔ قومی اسمبلی میں ممبران کی تعداد ۳۱۳ مقرر ہوئی جن میں سے ۱۶۹ ممبر مشرقی پاکستان سے اور ۱۴۴ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں سے لئے جانے تھے۔ مشرقی پاکستان کے واحد صوبے کی اپنی اسمبلی کے ممبران کی تعداد ۳۱۰ اور مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کی اسمبلیوں کی مشترکہ تعداد ۲۱۱ مقرر ہوئی۔ اس تقسیم سے مشرقی پاکستان کو قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں مغربی پاکستان پر ہمیشہ کے لئے اکثریت حاصل ہو گئی۔

اس آرڈر کے ذریعے یہ بھی کہا گیا کہ قومی اسمبلی منتخب ہونے پر آئین ساز اسمبلی کا کردار بھی ادا کرے گی اور ۱۲۰ دن کے اندر اندر نیا آئین مرتب کرے گی۔ ایسا نہ ہونے پر صدر خود آئین بنانے کا مجاز ہو گا۔

ایک پروویژنل آئینی آرڈر PROVISIONAL CONSTITUTION ORDER کے ذریعے عدالتوں کے اختیارات محدود کر دیئے گئے۔ جب اس آرڈر کے باوجود اعلیٰ عدالتیں ملٹری کی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سنتی رہیں تو یحییٰ خان نے ایک مزید حکم نامہ جاری کیا۔ جو عدالتوں کے اختیارات کی حدود کے متعلق شکوک دور کرنے کا آرڈر JURISDICTION OF COURTS (REMOVAL OF DOUBTS) کہلایا۔ اس کے ذریعے عدالتوں کے اختیارات سختی سے محدود کر دیئے گئے۔

لارنس زائرنگ نے اپنی مشہور کتاب PAKISTAN THE ENIGMA POLITICAL DEVELOPMENT

میں لکھا ہے۔

"ایوب خان نے اپنی حکومت کو قانونی حیثیت دینے کے لئے ایک پیچیدہ آئین بنایا تھا جسے تاریخ کے ملبے میں دفن کر دیا گیا۔ لیکن نظام سیاسی نہیں انتظامی ہی رہا اور اب اس کو فوجی شکل دے دی گئی۔"

یحیٰی خان نے ایک نئے آئین کا مسودہ تیار کرایا جسے اسمبلی کے ذریعے نافذ کرانا چاہتا تھا۔ یحیٰی اور اس کے فوجی جرنیلوں کے ٹولے کو یقین کامل تھا کہ جو الیکشن ان کے عہد میں ہو گا' اس کے نتائج سو فی صد ان کی خواہش اور پلان کے مطابق ہوں گے۔ لہٰذا آئین کو باقاعدہ چھپوا بھی لیا گیا تھا۔ لیکن ان کی بدقسمتی سے اس آئین کے نافذ ہونے کا موقع میسر نہ آیا۔ الیکشن کے نتائج یحیٰی کے لئے اس قدر مایوس کن تھے کہ تین دن تک اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ ملک بھر میں انتخابات ہوں' پرامن ہوں اور واضح نتائج کے حامل ہوں۔ لیکن سربراہ مملکت قومی اہمیت کے ایسے موقع پر بالکل گنگ ہو جائے اور چار روائتی الفاظ میں قوم کو مبارک باد بھی نہ دے تو ظاہر ہے سربراہ مملکت کی امیدوں پر پانی پھر چکا تھا۔

منتخب اسمبلی کا اجلاس ہی نہ بلایا گیا۔ لہٰذا آئین کا مسودہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اس اعتبار سے اس مسودے کی تفصیلات میں جانا بیکار ہے۔ البتہ ایک خاص شق جو اس میں شامل تھی قابل ذکر ہے۔ آئین میں تمام انتظامات برائے انتخابات صدر پاکستان موجود تھے لیکن اس خاص شق کے ذریعے یحیٰی خان کو پندرہ سال کے لئے ملک کا صدر بغیر انتخاب مقرر کر دیا گیا تھا۔ جب الیکشن کے نتائج و گرگوں ہو گئے تو اس شق کو بدل کر پندرہ کی بجائے پانچ سال کا عرصہ رکھ دیا گیا اور کتاب آئین کا یہ پورا صفحہ ہی تبدیل کر دیا گیا۔

۱۹۷۳ء کا آئین

دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ میں پاکستان کو مشرقی پاکستان کے علاقہ میں شکست فاش ہوئی اور صوبے کے علیحدگی پسند عناصر نے فاتح بھارتی فوج کے بل بوتے پر ایک الگ ملک بنگلہ دیش بنا لیا۔ یحیٰی خان کو صدر پاکستان کے عہدے سے الگ کر دیا گیا اور اس کا بنایا ہوا آئین پرنٹنگ کارپوریشن کی الماریوں میں دیمک کی خوراک بننے کیلئے دھرا رہ گیا۔ باقیماندہ ملک' یعنی صوبہ جات سرحد' پنجاب' بلوچستان اور سندھ جو مشترکہ طور پر مغربی پاکستان کہلاتا تھا اب پورا پاکستان ہو کر رہ گیا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی سربراہی میں ایک نئی حکومت کا قیام ہوا۔ چونکہ اس وقت ملک میں کوئی آئین نافذ نہیں تھا اس لئے

بھٹو کو مارشل لاء جاری رکھنا پڑا لیکن اس نے ۱۹۷۰ء میں منتخب ہوئے تمام ممبران اسمبلی کو طلب کر کے نئے آئین کی تشکیل کا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۷۳ء کے اوائل میں یہ آئین تیار ہو گیا اور اسمبلی کے تمام ممبران نے اسے متفقہ طور پر پاس کر دیا۔ اس طرح یہ پاکستان کا پہلا آئین تھا جس کو عوام کے منتخب نمائندوں نے تشکیل دیا اور وہ بھی متفقہ طور پر جو کہ تیسری دنیا میں ایک عجوبے سے کم نہیں۔ جس قومی اسمبلی نے یہ آئین بنایا وہ خود بہت سی جماعتوں پر مشتمل تھی، جن کے آپس میں سیاسی اور نظریاتی اختلافات حد سے بڑھے ہوئے تھے لیکن ان سب کی سیاسی فراست بے پناہ تحسین کی مستحق ہے کہ انہوں نے اپنے اختلافات کو بھلا کر ایک متفقہ آئین بنایا اور سب نے اس پر بغیر کسی پس وپیش کے دستخط کئے۔ یہ آئین پاکستانی عوام کے سیاسی شعور کا شاہد بھی ہے اور اس کی طرز تشکیل سے ان لوگوں کے جھوٹ اور افترا کی قلعی بھی کھلتی ہے جو پاکستانیوں کو سیاست سے بے بہرہ اور جاہل کہتے آئے ہیں

اس آئین کی اہم خصوصیات یہ ہیں کہ اس کی رو سے پاکستان ایک اسلامی جمہوریہ قرار پایا۔ ملک کے چاروں صوبوں پر مشتمل ایک وفاق تشکیل ہوا۔ وفاقی اسمبلی دو ایوانی (BICAMERAL) بنی۔ صوبائی اسمبلیاں یک ایوانی رہیں۔ نیشنل اسمبلی کے ممبران مختلف صوبوں سے آبادی کے تناسب پر اور سینیٹ کیلئے مساوی تعداد میں شامل ہوئے۔ صوبوں کو بہت سی خود مختاری دی گئی۔ بنیادی حقوق دیئے گئے اور مقننہ اور عدلیہ کو مکمل اختیارات اور آزادی دی گئی۔ عدلیہ اور انتظامیہ کو الگ کرنے کیلئے ایک مدت مقرر کر دی گئی تاکہ اس اقدام کے بعد عدلیہ ہر سطح پر آزاد ہو اور انتظامیہ کے زیر اثر نہ رہے۔ قوانین کو قرآن اور سنت کے مطابق ترمیم کرنے کی شق بھی رکھی گئی اور ربٰو کو ختم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ انتظامیہ کا سربراہ وزیر اعظم مقرر ہوا۔

آئین کے نفاذ کے ساتھ ہی ملک سے مارشل لاء اٹھا لیا گیا اور کوئی پندرہ برس کے بعد ملک میں جمہوری سیاست کا عمل ظہور پذیر ہوا۔

۱۹۷۷ء کے انتخابات

وزیر اعظم نے وقت سے پہلے ہی عام انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا اور مارچ ۱۹۷۷ء میں پوری قوم نے انتخابات میں حصہ لیا۔ حکمران جماعت، پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ حزب اختلاف، خصوصاً مسلم لیگ، جماعت اسلامی، تحریک استقلال، نیشنل عوامی پارٹی، جمعیت العلمائے اسلام، جمعیت العلمائے پاکستان خاکسار تحریک، مسلم کانفرنس اور پی ڈی پی پاکستان قومی اتحاد کے نام سے ایک متحدہ جماعت بن چکی تھی اور اسی اتحاد کے نام سے انہوں نے الیکشن میں حصہ لیا۔ پیپلز پارٹی کو تلوار اور قومی اتحاد کو ہل کا نشان ملا تھا۔ اتحاد نے یہ الزام لگایا کہ انتخابات میں دھاندلی کی گئی ہے اور انتظامیہ کو حکمران پارٹی



ذوالفقار علی بھٹو

نے وسیع پیمانے پر اپنے حق میں ووٹ ڈالنے کیلئے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ حزب اختلاف نے ملک بھر میں احتجاجی کارروائیاں شروع کر دیں اور وزیر اعظم کو مجبور کیا گیا کہ احتجاج کرنے والی جماعتوں کے نمائندوں سے مذاکرات ہوں۔ چنانچہ طویل بحث و مباحثہ کے بعد طے ہو گیا کہ انتخابات دوبارہ کرائے جائیں۔ طے شدہ شرائط کی دستاویز تیار ہو گئیں اور صرف دستخط کرنا باقی رہ گئے۔ احتجاج اور ہنگامے ختم ہو گئے۔ لیکن اس ساری تگ و دو کے نتیجے میں ملک میں امن کا برقرار ہونا اور سیاسی مذاکرات کی کامیابی' جو بذات خود کامیاب سیاست کی دلیل تھی' ملک اور قوم کے کسی کام نہ آئی اور پاکستانی فوج کے سربراہوں نے ایک بار پھر مارشل لاء لگا کر عنان حکومت سنبھال لی۔

۱۹۷۷ء کا مارشل لاء

پہلے اور دوسرے مارشل لاء کے زمانے میں میں ایک جونیئر آفیسر تھا اور اس وجہ سے مارشل لاء کے ٹولے سے میرا براہ راست کوئی سروکار نہ تھا۔ ۱۹۷۷ء میں میں سیکرٹری وزارت داخلہ تھا اور اس عہدے کے اعتبار سے مجھے کافی اونچی سطح پر انتظامی امور میں دخل حاصل تھا۔ شب درمیان ۴ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو دو دیگر سیکرٹری صاحبان نے آدھی رات گئے مجھے ٹیلیفون کیا اور کہا کہ کچھ فوجی افسران ان کے گھروں میں وارد ہوئے ہیں اور انہیں جی ایچ کیو لے جانے پر مصر ہیں۔ یہ سیکرٹری صاحبان' ظاہر ہے کہ بدحواس اور بے چین ہو رہے تھے کہ یہ طلبی کہیں پروانہ ء مرگ ہی نہ ثابت ہو۔ میں نے لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی جو ان دنوں میں انٹر سروسز انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل تھے کو فون کیا۔ پہلے فون پر تو جیلانی صاحب نے کمال معصومیت کے ساتھ قطعی لاعلمی کا اظہار کیا لیکن ایک آدھ گھنٹہ کے بعد جب میں نے دوبارہ فون کیا تو فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ فوج نے حکومت سنبھال لی ہے۔ ظاہر ہے کہ حسب سابق اس مرتبہ بھی جرنیلوں نے تمام انتظامات پہلے سے مکمل کر رکھے تھے۔ سب سے پہلے فیڈرل سکیورٹی فورس FEDERAL SECURITY FORCE پر جو جدید اسلحہ سے لیس تھی حملہ ہوا۔ چاروں طرف سے ناکہ بندی کر کے اس کے تمام اسلحہ خانوں' گاڑیوں' دفتروں اور بارکوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ ڈائریکٹر جنرل مسعود محمود نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی' یہ کوشش اتنی ہی تھی کہ جب اس کے گھر پر چھاپہ مار فوجی افسران پہنچے تو اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا اور مجھے S.O.S ٹیلیفون کرنے شروع کر دیئے۔ اس صورت میں نہ تو میں کچھ کر سکتا تھا اور نہ ہی مسعود محمود۔ بہرحال میں نے اسے جنرل غلام جیلانی سے گفتگو کا حوالہ دے کر سمجھایا کہ مزاحمت کرنا بے سود اور ہو سکتا ہے نقصان دہ بھی ہو۔ مسعود محمود کو تسلی نہ ہوئی۔ تب میں خود اس کے گھر جو قریب ہی تھا چلا گیا پھاٹک کے پاس اس کی بیوی اور دونوں بچے کھڑے تھے۔ مسعود محمود کو فوجی افسران دروازہ توڑ کر لے جا چکے تھے۔ میں نے مسعود محمود کی بیوی کو مناسب

الفاظ میں تسلی دی اور بچوں کو بھی حوصلہ دیا۔ اگلے روز بڑے بچے کا میٹرک کا امتحان تھا۔ دیگر افسران بشمول ڈائریکٹر انٹیلی جنس (سول)، سیکرٹری وزیراعظم، سیکرٹری کیبنٹ (CABINET) ڈائریکٹر جنرل ایف آئی اے (FIA) جو سابقہ ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھا، سب گرفتار ہو کر جی ایچ کیو اور وہاں سے مختلف مقامات پر پہنچا دیئے گئے جہاں ان سے تفصیلی پوچھ گچھ (INTEROGATION) ہوئی تھی۔ وزیراعظم جن کو چند گھنٹے پیشتر جنرل ضیاء الحق نے اپنی اور تمام فوج کی وفاداری کا یقین دلایا تھا، معہ تمام وزراء کے گرفتار کر لئے گئے۔ حزب اختلاف کے چیدہ چیدہ اکابرین گرفتار ہوئے۔ اگلی صبح جنرل ضیاء الحق، کمانڈر انچیف پاکستان آرمی نے اپنے آپ کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہونے کا اعلان کر دیا، اور اس طرح، ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جب صبح سورج طلوع ہوا تو ملک میں تیسرا مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا۔ رات کی کارروائی مکمل ہو گئی تو جنرل ضیاء الحق نے سپریم کورٹ کے چیمبر میں چیف جسٹس جسٹس محمد یعقوب علی خان سے ملاقات کی اور قانونی مشورے کی فرمائش کی۔ جیسا کہ بعد کے حالات سے ظاہر ہوا، اس مشورے کی چنداں ضرورت نہیں تھی کیونکہ جرنیلوں نے اپنا پلان اور پروگرام مفصل طور پر پہلے ہی سے طے کیا ہوا تھا۔ تاہم جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ مارشل لاء عارضی اور صرف نوّے دن کیلئے ہے، مقصد اس کا ملک میں فضا کو خوشگوار بنانا اور انتخابات کی راہ ہموار کرنا ہے۔ چیف جسٹس نے مشورہ دیا کہ اولاً آئین کو بالکل نہ چھیڑا جائے، دوئم کوئی فوجی عدالتیں قائم نہ کی جائیں، سوئم صدر پاکستان (چودھری فضل الٰہی) کو اپنے عہدے پر برقرار رکھا جائے، چہارم مارشل لاء کی انتظامیہ سوائے امن برقرار رکھنے کے، بقیہ نظام حکومت میں دخل انداز نہ ہو اور اپنے مقرر کردہ نوے دن کے عرصے کے بعد اختیارات واپس سول انتظامیہ کو لوٹا کر مارشل لاء ختم کر دے۔ اور فوج واپس اپنی بیرکوں میں چلی جائے۔ علاوہ بریں اگر اس نوّے دن کے دوران کوئی فرد یا جماعت مارشل لاء کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرتی ہے تو یہ عدالت اپنے سابقہ فیصلے (عاصمہ جیلانی کیس) کی پابند ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے چیف جسٹس کو یقین دلایا کہ ان تمام مشوروں پر مارشل لاء انتظامیہ سختی سے کاربند رہے گی۔ چیف جسٹس نے اس تمام گفتگو کو من و عن ریکارڈ کیا اور ایک ایک کاپی سپریم کورٹ کے ہر جج کو روانہ کر دی اور ایک کاپی سپریم کورٹ کے ریکارڈ میں محفوظ کر دی۔

جنرل ضیاء الحق اور چیف جسٹس سپریم کورٹ کے درمیان یہ گفتگو صبح دس بجے کے قریب ہوئی۔ اس کے فوراً بعد مجھے ٹیلیفون آیا۔ آواز جنرل ضیاء الحق کی تھی۔ فرمایا "چودھری صاحب، ملاقات ہو سکتی ہے؟" میں نے عرض کیا حکم دیں۔ بارہ بجے کا وقت طے ہوا اور میں جی ایچ کیو ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ مجھے دیکھتے ہی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور کہا یہ اقدام میں نے نہایت ہی مجبوری اور دکھ سے کیا ہے۔ مزید کہا کہ میرا کوئی ارادہ اپنے آپ کو سول انتظامیہ کے بکھیڑوں میں ڈالنے کا نہیں ہے۔ میرا اپنا فوج کا کام ہی مجھے ہمہ وقت مصروف رکھتا ہے، لہٰذا وزارت داخلہ کا سب کام میں خود ہی کرتا

رہوں۔ پھر مجھ سے دریافت کیا کہ مارشل لاء کے متعلق عوام کا کیا ردِ عمل ہو گا۔ میں نے جواب دیا کہ یہ پہلا مارشل لاء تو ہے نہیں اس لئے عوام کا ردِ عمل بڑا سلجھا ہوا ہو گا۔ وہ جاننا چاہیں گے کہ اس کا جواز کیا ہے، یہ کب تک رہے گا اور ملک کے آئین کے ساتھ مارشل لاء انتظامیہ کیا سلوک کرے گی۔ چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے بڑے اعتماد اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا کہ میں اور میرے رفقاء ان تمام باتوں کے متعلق پورے اتفاق رائے سے نہایت واضح موقف رکھتے ہیں۔ مارشل لاء لگانے کا مقصد حکومت اور حزب اختلاف کے درمیان کشیدگی کی فضا کو خوشگوار بنانا ہے۔ اس مقصد کیلئے تین ماہ کا عرصہ مقرر ہے اور اس عرصے میں ایک دن کا بھی اضافہ نہیں ہو گا۔ آئین کو ہر گز نہیں چھیڑا جائے گا صرف تین ماہ کیلئے معطل کیا جائے گا تاکہ امن عامہ برقرار رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ چودھری فضل الٰہی بدستور پاکستان کے صدر رہیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ اس صورت میں عوام کا ردِ عمل مخالفانہ نہیں ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہت سے لوگ اسے اطمینان کا باعث سمجھیں۔

(یہاں ایک گزارش ضروری ہے.... جنرل ضیاء الحق کی مندرجہ ذیل تقریر اور بعد میں آئین اور اس کی ترامیم کا آزاد ترجمہ اور مختصر متن یا اقتباس ہی دیئے گئے ہیں۔ مکمل متن کتاب کے آخر میں انگریزی میں شامل کر دیئے گئے ہیں)

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو پاکستان ٹیلی ویژن پر تقریر کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے کہا۔

"میں خدائے بزرگ و برتر کا شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے موقع دیا کہ میں اس ملک کی عظیم قوم سے خطاب کروں۔ آپ نے سن لیا ہو گا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ختم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ ایک عبوری حکومت قائم ہوئی ہے............

ابھی تک جو ردِ عمل اس اقدام کا ہوا ہے حوصلہ افزا ہے...... جس کیلئے میں قوم کا اور بہادر اور مومن افواج کا شکر گذار ہوں......

فوج کا اقتدار سنبھالنا کبھی خوشگوار اقدام نہیں ہوتا کیونکہ ہماری فوج واقعتاً چاہتی ہے کہ ملک کی حکومت عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں رہے......

میں یہ بات واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ نہ میں کوئی سیاسی عزائم رکھتا ہوں اور نہ ہی فوج اپنے جنگی پیشہ سے الگ ہونا چاہتی ہے...... میرا کام صرف اور صرف ملک میں الیکشن کروانا ہے۔ جو اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ہوں گے۔

الیکشن کے فوراً بعد اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو سونپ دیا جائے گا۔ میں آپ کو حلفیہ یقین دلاتا ہوں کہ میں اس پروگرام سے انحراف نہیں کروں گا۔

آئندہ تین ماہ میں صرف الیکشن کی تیاری پر صرف کروں گا اور بطور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور کسی کام پر وقت ضائع نہیں کروں گا"۔

یہی متن باقی جرنیلوں کی گفتگو اور اعلانات کا رہا۔ مقصد، جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا عوام کے فوری ردِعمل کو استوار کرنا تھا۔ ورنہ جب ملک میں ہنگامہ آرائی نہیں تھی، حکومت اور حزب اختلاف میں کوئی اختلاف باقی نہیں رہا تھا، دوبارہ الیکشن کرانے پر فیصلہ ہو چکا تھا تو پھر مارشل لاء کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ لہٰذا نوّے دن کا فارمولا کارگر سمجھا گیا تاکہ عوام یہ سمجھ کر چپ رہیں کہ اس قلیل عرصے کیلئے کیا اعتراض کریں۔

نصرت بھٹو کیس

بیگم نصرت بھٹو نے اپنے خاوند کی نظر بندی کے خلاف رٹ WRIT PETITION دائر کی۔ اسی قسم کی درخواستیں دیگر نظر بند لیڈروں کی طرف سے بھی دائر ہوئیں۔ سپریم کورٹ نے ان تمام اپیلوں کو یکجا کر کے ایک ساتھ ہی سننے کا فیصلہ کیا اور یہ حکم جاری کیا کہ تمام درخواست دہندگان کو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں لے آیا جائے تاکہ اگر ضروری سمجھا جائے تو ان کو فرداً فرداً یا اکٹھا عدالت میں طلب کیا جا سکے۔ سہالہ ریسٹ ہاؤس راولپنڈی کے نزدیک ہی واقع ہے اور وقتاً فوقتاً سیاستدانوں کی نظر بندی کیلئے بطور سب جیل استعمال ہوتا رہا ہے۔ سابقہ اٹارنی جنرل مسٹر یحییٰ بختیار چیف جسٹس محمد یعقوب علی خان کو ان کے چیمبر میں ملے اور معزول شدہ وزیراعظم کی ضمانت پر رہائی کی درخواست دی۔ چیف جسٹس نے کہا کہ درخواست باقاعدہ رجسٹرار کو حسب ضابطہ دی جائے۔ یحییٰ بختیار نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر بعد اے کے بروہی نے مارشل لاء انتظامیہ کے وکیل کی حیثیت سے اسی طرح چیف جسٹس محمد یعقوب علی خان کو چیمبر میں آ کر درخواست کی کہ نظر بندوں کو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں لائے جانے کا حکم واپس لے لیا جائے۔ چیف جسٹس نے بروہی کو بھی وہ مشورہ دیا کہ درخواست حسب ضابطہ رجسٹرار عدالت کو پیش کی جائے، عدالت باقاعدہ ایک بینچ کی شکل میں اس پر غور کرے گی اور فیصلہ دے دے گی۔ لیکن بروہی نے ایسا نہ کیا۔ البتہ اسی روز ایک مارشل لاء آرڈر سے آئین میں ترمیم کر دی گئی، جس کی رو سے چیف جسٹس کی سروس کی شرائط میں تبدیلی کر دی گئی اور اس طرح چیف جسٹس اپنے عہدے سے ریٹائر ہو گئے۔

ملک میں تو ذرائع ابلاغ کی زبان گنگ تھی لیکن بیرون ملک اس اقدام پر بہت تبصرہ ہوا۔ ۲۳ ستمبر کے روزنامہ ملّت لندن نے جلی حروف میں شہ سرخی لگائی کہ

"چیف جسٹس سپریم کورٹ کو اس وقت عہدے سے برطرف کیا گیا جب وہ مارشل لاء کے خلاف رٹ کی درخواست کی سماعت کر رہے تھے اور ملک کی عدلیہ کو کٹھ پتلی بنا

کرر کھ دیا گیا ہے"

اسی اخبار نے ۲۶ ستمبر کو لکھا کہ

"ضیاءالحق اور فوجی ٹولے کے سامنے نہ جھک کر چیف جسٹس نے عدلیہ کے لئے ایک شاندار روایت قائم کر دی ہے"۔

لنڈن ٹائمز نے ۲۳ ستمبر کو لکھا کہ

"جنرل ضیاءالحق نے چیف جسٹس محمد یعقوب علی خان کو اس لئے معزول کیا کہ چیف جسٹس سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی نظر بندی کے خلاف مقدمہ سماعت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے ان کو ریٹائرڈ کر دیا۔ ۵ جولائی کو جب فوج نے اقتدار سنبھالا تو اس کا مؤقف تھا کہ اس کے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کا حکم ملک کے آئین پر فوقیت رکھتا ہے۔ چیف جسٹس کو ریٹائرڈ کرنا اسی مؤقف کی ڈرامائی گو بھونڈی توثیق ہے"

اسی دن گارڈین لندن نے بھی لکھا کہ

"پاکستانی فوج نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو اس وقت عہدہ سے علیحدہ کیا جب وہ سابقہ وزیر اعظم کی نظر بندی کے خلاف رٹ کی سماعت کرنے والے تھے"۔

دراصل خوف اس بات کا تھا اس مقدمے میں بھی چیف جسٹس محمد یعقوب علی خان عاصمہ جیلانی بنام سرکار والے مقدمے میں اپنے مشہور فیصلے کے مطابق مارشل لاء کو ایک غیر قانونی اقدام قرار دے دیں گے۔ بیرون ملک پریس نے اسی امر کی طرف واضح اشارے کئے۔

پاکستان میں مارشل لاء کے متعلق قانونی فیصلوں کی تاریخ

پاکستان میں مارشل لاء کے متعلق سپریم کورٹ نے وقتاً فوقتاً جو فیصلے کئے ہیں ان پر ایک طائرانہ نظر ڈال لینا دلچسپ مطالعہ ہو گا۔ ایوب خان کے مارشل لاء کو DOSSO کیس میں چیلنج کیا گیا تھا۔ مقدمے میں بحث کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ جب ملک میں کوئی بدامنی نہیں تھی تو مارشل لاء کا کیا جواز تھا۔ مسٹر جسٹس محمد منیر، چیف جسٹس سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں یہ لکھا کہ ایک کامیاب فوجی انقلاب از خود ایک نیا نظام قانون (A NEW LEGAL ORDER) ہوتا ہے۔ جج اور عدالتیں اس نئے قانون کی پابند ہوتی ہیں لہٰذا اس کے خلاف عدالت کسی رٹ کی سماعت نہیں کر سکتی۔ اس فیصلے کا قانونی ماحصل یہ ہوا کہ مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کو ملک میں وہ اختیار اور اقتدار دے دیا گیا جو بادشاہوں کے زمانے میں ہوتا تھا اور جس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائی جا سکتی تھی نہ سنی جا سکتی تھی۔ یہ قطعی بے لگام اقتدار ایوب خان کو سپریم کورٹ نے ۱۹۵۸ء میں DOSSO کیس نے عطا کیا۔

مسٹر الطاف گوہر اور مس عاصمہ جیلانی نے یحییٰ خان کے مارشل لاء کے خلاف اپیلیں کیں جو مندرجہ بالا سپریم کورٹ کے فیصلے کی رو سے ہائی کورٹ میں خارج کر دی گئیں۔ ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیلیں سپریم کورٹ میں ہوئیں۔ سپریم کورٹ نے دونوں اپیلوں کو اکٹھا ہی سنا۔ یہ اپیلیں اس وقت سماعت کیلئے پیش ہوئیں جب یحییٰ خان معزول ہو چکا تھا لیکن ملک میں مارشل لاء بدستور تھا۔ سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ یحییٰ خان کا مارشل لاء غیر قانونی اور خود یحییٰ خان اقتدار کا غاصب تھا۔ اس طرح سپریم کورٹ نے DOSSO کیس کے فیصلے کو یکسر بدل دیا۔ مسٹر جسٹس محمد یعقوب علی خان نے یحییٰ خان کے مارشل لاء کو ملک سے غداری قرار دیا اور کہا کہ ملک کا آئین کسی صورت میں بھی منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ مارشل لاء صرف اسی صورت میں نافذ کیا جا سکتا ہے جب امن و امان قطعی طور پر پامال ہو چکا ہو اور اس صورت میں بھی صرف محدود عرصے کیلئے۔ اس محدود عرصے میں مارشل لاء حکام فقط روزمرّہ کے معمولات تک انتظام کو ہاتھ میں لے سکتے ہیں تاکہ عوام کو زندگی کی سہولتیں میسر رہیں اور یہ اقدام عوام ہی کی بہتری کی خاطر کیا جائے۔ کسی طور بھی مارشل لاء ایک نیا نظام قانون LEGAL ORDER نہیں بنا سکتا اور نہ ہی سول عدالتوں کے اختیارات کو سلب کر سکتا ہے۔ مسٹر اے کے بروہی کو اس مقدمے میں بطور قانونی مشیر کے عدالت کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا۔ بروہی نے اپنے دلائل میں مارشل لاء کی بھرپور مخالفت کی۔

جون ۱۹۷۷ء میں جب حکومت کے خلاف پی این اے کی تحریک زوروں پر تھی اور ہنگامے بالکل بے قابو ہو گئے تو وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے شرپسندوں کے خلاف مقدمات کی سماعت کیلئے چند فوجی عدالتیں قائم کر دیں۔ ان فوجی عدالتوں کے قیام کے خلاف اپیلیں ہوئیں۔ سندھ ہائی کورٹ نے ان کے قیام کی توثیق کر دی لیکن پنجاب ہائی کورٹ نے انہیں خلاف آئین قرار دیا۔ وفاقی حکومت نے لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کی اور ہائی کورٹ کے فیصلے پر عملدر آمد کے خلاف حکم امتناعی STAY ORDER کی درخواست دی۔ چیف جسٹس سپریم کورٹ نے یہ STAY ORDER دینے سے انکار کر دیا اور وزیراعظم کو فوجی عدالتیں بند کرنی پڑیں۔

نصرت بھٹو کیس جو جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے زمانے میں ہوا' سپریم کورٹ میں سماعت کیلئے اس وقت پیش ہوا جب جسٹس محمد یعقوب علی خان ریٹائر ہو چکے تھے اور مسٹر جسٹس انوار الحق چیف جسٹس مقرر ہو گئے تھے۔ عدالت نے نظریہ ضرورت DOCTRINE OF NECESSITY کو بنیاد رکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ ملک کے حالات کے تحت مارشل لاء کا لگنا آئین کی منسوخی نہیں بلکہ فقط ایک محدود تبدیلی CONSTITUTIONAL DEVIATION ہے۔ فیصلے میں یہ بھی کہا گیا کہ مارشل لاء حکام مارشل لاء آرڈر اور ریگولیشن جاری کر سکتے ہیں لیکن ان آرڈر اور ریگولیشن کے تحت اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات نہیں چھین سکتے

بلکہ خود ایسے آرڈر اور ریگولیشن اعلیٰ عدالتوں کے زیر اختیار ہوں گے۔ آخر میں یہ بھی کہا گیا کہ چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر آئین کے تحت تمام اختیارات کا حامل ہے حتیٰ کہ خود آئین کی ترمیم بھی کر سکتا ہے۔ اس مقدمے میں مسٹر اے کے بروہی کو مارشل لاء حکومت کا وکیل مقرر کیا گیا تھا اور اس بار اس نے مارشل لاء کی حمایت میں فصاحت کے دریا بہا دیئے۔

بروہی بے شک ایک ماہر قانون دان تھے عاصمہ جیلانی کیس میں انہوں نے مارشل لاء کے نظام کی مخالفت کی یہ اس کے قانونی شعور اور قانون کی بالادستی کی حمایت کا مظہر تھا۔ نصرت بھٹو کیس میں انہوں نے مارشل لاء نظام کی حمایت کی یہ محض ذوالفقار بھٹو سے دشمنی اور اپنے لئے اقتدار کی ہوس کا نتیجہ تھا ورنہ قانون کی دنیا میں اتنا اونچا مقام حاصل کرنے کے بعد ایسی ذہنی بددیانتی INTELECTUAL DISHONESTY بعید از قیاس ہے۔

مسٹر جسٹس دراب پٹیل جو ریٹائر ہو چکے ہیں 'نصرت بھٹو کیس کے زمانے میں سپریم کورٹ کے جج تھے اور مندرجہ بالا فیصلے میں شریک تھے۔ اس فیصلے کے متعلق ۳۱ جنوری ۱۹۸۵ کے MAG کے شمارے میں بیان دیتے ہوئے انہوں نے کہا

> PLDS.C ۶۵۷ ۱۹۷۷ پر جو فیصلہ رپورٹ ہوا ہے اس میں مارشل لاء کی توثیق دو وجوہات کی بنا پر کی گئی۔ پہلی وجہ تھی امن عامہ میں خلل، جو الیکشن میں دھاندلی کی وجہ سے ہوا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ہمیں حکومت کی طرف سے حلفیہ طور پر یقین دلایا گیا تھا کہ نئے الیکشن جلد ہی کرائے جائیں گے۔
>
> میں فیصلے سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرتا ہوں جو صفحہ ۷۲ پر درج ہے۔
>
> "اپنے مؤکل (یعنی مارشل لاء حکام) سے ہدایات لینے کے بعد مسٹر اے کے بروہی نے ہمیں بتایا کہ جیسے ہی عوامی عہدوں پر فائز اصحاب کا احتساب ہو چکتا ہے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر ملک میں انتخابات کرانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ فاضل اٹارنی جنرل نے کہا کہ اس کام میں تقریباً چھ ماہ درکار ہوں گے لہٰذا چھ ماہ کے بعد ملک میں الیکشن ہو جائیں گے"۔
>
> ہم سب کا خیال تھا کہ الیکشن کرانے کی مدت کا تخمینہ بڑھ کر سال یا زیادہ سے زیادہ دو سال تک چلا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی ۱۹۷۹ء میں الیکشن کرانے کا اعلان ہو چکا تھا۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں کیا ہوا یہ ایک اور بات ہے۔ لیکن ہمارا فیصلہ اسی بنیاد پر تھا کہ الیکشن جلد ہی ہونے والے ہیں۔
>
> نتیجتہً قانونی پوزیشن یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین بدستور ملک کا افضل قانون ہے

ماسوائے ان حصص کے جو التوا میں ڈالے گئے اور یہ نظریۂ ضرورت کے تحت کیا گیا۔(۱۰)
جسٹس دراب پٹیل کے مندرجہ بالا بیان کے مطابق مارشل لاء حکام کا اعلان کہ پورا آئین تعطل میں ہے تسلیم نہ ہوا اور سپریم کورٹ نے اس اعلان کو غیر قانونی قرار دیا۔ یہ فیصلہ ملک میں قانون کی حیثیت رکھتا تھا تا آنکہ ۲۵ مارچ ۱۹۸۱ء کو چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے عبوری آئینی حکم PROVISIONAL CONSTITUTION ORDER' یا پی سی او جاری کیا۔

۱۹۷۳ء کے آئین میں ترامیم

نصرت بھٹو کیس کے فیصلے نے جو اختیارات مارشل لاء حکام کو دیئے ان کی رو سے آئین میں ترامیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اکتوبر ۱۹۷۹ء میں آرٹیکل ۲۱۲ الف کا اضافہ کیا گیا جس کے تحت ملک بھر میں فوجی عدالتوں کا قیام ہوا۔ یہ عدالتیں مارشل لاء آرڈرز اور ریگولیشن کی خلاف ورزی کے علاوہ ملک کے دیگر قوانین کے تحت بھی مقدمات کی سماعت کے اہل بنائی گئیں۔ اس آرٹیکل کا ذیلی سیکشن ۳ مندرجہ ذیل ہے۔

> "آئندہ جس کسی معاملے میں کسی فوجی عدالت نے سماعت کی ہو' یا جو کسی فوجی عدالت کے سپرد کیا گیا ہو' ایسے معاملے میں کوئی سول عدالت بشمول ہائی کورٹ کوئی حکم امتناعی' دیگر حکم یا سماعت نہیں کرے گی اور اگر کسی ایسے معاملے میں کوئی اپیل سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے تو وہ اپیل خارج تصور ہو گی۔
> اس آرٹیکل کو بقیہ تمام آئین پر فوقیت حاصل ہو گی"

بالفاظ دیگر مارشل لاء انتظامیہ نے سپریم کورٹ کے فیصلہ نصرت بھٹو کیس کے ایک حصہ کی آڑ لے کر آئین میں ترمیم کی' اور وہ بھی ایسے کہ اسی فیصلے کے دوسرے اور اہم حصے کی نفی ہو گئی قارئین کو یاد ہو گا کہ سپریم کورٹ نے یہ بھی کہا تھا کہ اعلیٰ عدالتیں فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل سن سکیں گی۔ لیکن اس ترمیم نے اعلیٰ عدالتوں کے اس اختیار کو مٹا دیا اور فوجی عدالتوں کو سب سے بالا کر دیا' نہ صرف مارشل لاء آرڈرز اور ریگولیشن کی مد میں بلکہ ملک کے بقیہ قوانین میں بھی۔

اس ترمیم کے باوجود بعض اعلیٰ عدالتیں فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سنتی رہیں۔ چنانچہ چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے دوسرا پی سی او جاری کیا جس کے ذریعے آئین میں مزید ترامیم کی گئیں۔ مثلاً ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل ۶ کے تحت کوئی شخص جو آئین کو منسوخ کرے' یا ایسا کرنے کی کوشش یا سازش سے آئین کی تخریب کرے' ایسا کرنے کی کوشش یا سازش کرے' یا ایسا کرنے کیلئے طاقت استعمال کرے یا طاقت کا مظاہرہ کرے' یا کوئی اور غیر آئینی ذرائع استعمال کرے' وہ جرم غداری

کا مرتکب ہو گا۔ پی سی او نے اس آرٹیکل کو معطل کر دیا۔

پی سی او کا آرٹیکل ۱۵ درج ذیل ہے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کا اعلان صدر پاکستان کے تمام وہ احکامات جن کے ذریعے آئین میں ترامیم کی گئی ہیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ایسے ہی احکامات مارشل لاء ریگولیشن مارشل لاء آرڈرز اور تمام وہ احکامات اور قوانین جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد جاری ہوئے ہیں ان سب کی توثیق کی جاتی ہے کہ وہ سب کے سب با قاعدہ اختیارات کے تحت جاری ہوئے ہیں اور کوئی عدالت یا کسی عدالت کا کوئی فیصلہ ان احکامات و ترامیم میں حارج یا مخل نہیں ہو سکتا۔ نیز احکامات و ترامیم جاری و ساری ہیں تا آنکہ انکو مجاز اتھارٹی تبدیل یا منسوخ نہ کرے۔

(۲) تمام احکامات ' کارروائی یا فعل جو کسی اتھارٹی یا کسی فرد نے ' ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد صدر پاکستان ' یا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے ' یا کسی مارشل لاء آرڈر یا ریگولیشن ' قانون ' نوٹیفیکیشن ' رول ' احکام ' بائی لا ' کے تحت جاری کیا یا سرانجام دیا ' یا کوئی احکام یا سزا دی ' وہ سب کے سب با اختیار اور مجاز تصوّر ہوں گے اور ان کی توثیق کی جاتی ہے کہ وہ با اختیار ہیں اور ہمیشہ سے تھے اور کوئی عدالت ان میں مخل ہونے کا اختیار نہیں رکھتی۔

(۳) جہاں کہیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مارشل لاء آرڈر کے تحت کوئی فوجی عدالت قائم ہوتی ہے اور کسی معاملے میں سماعت یا کارروائی کرتی ہے ' یا کوئی مقدمہ یا معاملہ اس کے سپرد کیا جاتا ہے ' تو کوئی سول عدالت ' بشمول سپریم کورٹ کے اس مقدمے یا معاملے میں کوئی حکم امتناعی یا کوئی دوسرا حکم جاری نہیں کر سکتی اور نہ کوئی اپیل وغیرہ اس کے خلاف سن سکتی ہے۔ نیز تمام مقدمات و معاملات جو فی الوقت کسی سول عدالت میں زیر سماعت ہیں اور جن پر کسی فوجی عدالت نے غور کرنا شروع کر دیا ہے وہ سب کے سب ان سول عدالتوں سے خارج تصوّر ہوں گے۔

(۴) کوئی سول عدالت اس کی مجاز نہیں کہ وہ کوئی مقدمہ ' یا شکایت کسی اتھارٹی یا فرد کے خلاف سنے یا کوئی کارروائی اس کے خلاف کرے ' محض اس بنا پر کہ اس اتھارٹی یا فرد نے (کسی مارشل لاء آرڈر یا فوجی عدالت کی کی کارروائی کے سلسلے میں) کوئی احکام جاری کئے یا کوئی عمل کیا۔

(۵) کوئی سول عدالت بشمول ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ ' قطعہ نظر کسی بھی عدالتی فیصلے کے جوان عدالتوں کی اپیل سننے یا نظر ثانی کرنے کے اختیارات کے متعلق ہو ' مجاز نہیں ہوگی کہ وہ

(ا) کسی مارشل لاء آرڈر یا ریگولیشن جو چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر یا کسی مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے جاری کیا ہو ' یا ان کے کسی فعل ' عمل پر جوانہوں نے کیا ہو یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ' کے متعلق کوئی حکم ' خصوصاً ان کے با اختیار ہونے کے متعلق جاری کریں۔

(ب) کسی فوجی عدالت کے فیصلے کے متعلق ' دی ہوئی سزا کے متعلق یا فیصلے کے اثرات و نتائج کے متعلق ' خصوصاً ایسی فوجی عدالت کے اختیارات کے متعلق کوئی حکم جاری کریں۔

(ج) کسی مقدمہ یا کارروائی کے متعلق جس کا اختیار کسی فوجی عدالت یا ٹریبونل کو دیا گیا ہو ' کوئی حکم امتناعی جاری کریں یا کوئی کارروائی کریں یا شکایت کی سماعت کریں۔

(د) چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر یا کسی مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے خلاف یا کسی ایسے فرد کے خلاف جوان کے ماتحت کام کر رہا ہو کوئی حکم جاری کریں۔

(٦) کوئی ایسا حکم ' حکم امتناعی یا عمل جس کا ذکر اوپر دفعہ (۵) میں کیا گیا ' کو حکم عدالت ' جو اس نوٹیفیکشن کے بعد یا پہلے جاری ہوا ہو منسوخ سمجھا جائے گا اور قطعی قابل عمل نہ ہوگا اور ہر مقدمہ یا کارروائی جو کسی عدالت کے زیر سماعت ہو ' خارج سمجھی جائے گی۔ نیز یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی ایسا عمل یا عدالت کا فیصلہ کسی مارشل لاء اتھارٹی یا اس کے ماتحت کام کرنے والے کسی سول ملازم کے خلاف لاگو نہیں ہوگا۔

آرٹیکل ۱٦ جس کے تحت آئین میں ترمیم کا اختیار لیا گیا ذیل میں درج ہے۔

"صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر آئین میں ترامیم کرنے کے مجاز ہوں گے اور ان کا یہ اختیار ہمیشہ سے جائز تصوّر ہوگا"

(اس آرٹیکل کے ذریعے پہلے سے کی ہوئی ترامیم کو بھی تحفظ دے دیا گیا)

آرٹیکل ۷ کے مطابق سپریم کورٹ کے اور ہائی کورٹ کے جج صاحبان چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے PROVISIONAL CONSTITUTION ORDER کے تحت حلف اٹھانے کے پابند قرار دیئے گئے۔ ان میں

سے بعض جج صاحبان نے یہ حلف لینے سے انکار کر دیا اور بعض ایسے بھی تھے جن کو حلف لینے کیلئے دعوت ہی نہیں دی گئی جس سے مراد یہ تھی کہ ان کو ان کے عہدے سے برخواست کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ سے جسٹس دُراب پٹیل اور لاہور ہائی کورٹ سے جسٹس آفتاب فرخ نے یہ حلف لینے سے انکار کیا۔ دیگر کئی جج صاحبان نے بھی جو ملک کے مختلف ہائی کورٹوں سے متعلق تھے' ایسا ہی کیا۔

اس طرح اعلیٰ عدالتوں کو ان کے اختیارات سے محروم کر دیا گیا تاکہ وہ کسی فوجی عدالت (خواہ وہ کتنی ہی ادنیٰ عدالت کیوں نہ ہو) کے فیصلے یا کارروائی یا حکم کے خلاف کوئی اپیل نہ سن سکیں اور نہ نظرثانی کر سکیں۔ یہ اقدام سپریم کورٹ کے فیصلہ نصرت بھٹو کیس کے ایک حصے کی مدد سے کیا گیا جس میں مارشل لاء نظام کو آئین میں ترامیم کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی حالانکہ اسی فیصلے میں واضح طور پر یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اعلیٰ عدالتوں کو فوجی عدالتوں کے فیصلوں پر نظرثانی کرنے کا اختیار رہے گا۔ ظاہر ہے کہ جب خود سپریم کورٹ نے آئین میں ترمیم کا اختیار چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو تفویض کر دیا تو پھر اس کو آئین کے تابع سول عدالتوں بشمول سپریم کورٹ کے فیصلوں کا پابند رہنے پر کون مجبور کر سکتا تھا' خصوصاً وہ فیصلے جو اسے ناپسند ہوں۔

۸ جون ۱۹۸۳ء کے جنگ کے شمارے میں ریٹائرڈ جسٹس فخرالدین جی ابراہیم نے ایک بیان میں کہا کہ:

"عدلیہ کی روح ناپید ہو گئی ہے اور انصاف کے ایوان خاموش قبریں بن گئی ہیں۔ اسلام آزادی اور مساوات کا حق ہر فرد کو دیتا ہے لیکن پاکستان میں یہ حق چھین لیا گیا ہے۔ جج صاحبان کو فوری طور پر عہدے سے الگ کیا جا سکتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں قانون کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

پی سی او بذات خود ملک کا قانون اولیٰ بن گیا اور ملک کی سول عدالتیں اختیارات سے محروم کر دی گئیں۔ اس اقدام سے ظاہر ہے کہ عوام کے بنیادی حقوق بری طرح سے مجروح ہوئے۔ فوجی عدالتوں کے سربراہ اور ممبر صاحبان کتنے ہی نااہل ہوں اور قانون سے کتنے ہی نابلد' ان کے فیصلے حرف آخر ہو گئے اور ان فیصلوں کے خلاف ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے دروازے بند ہو گئے۔ ایسا کڑا اقدام کرنے میں کیا مصلحت تھی یہ تو مارشل لاء کے ارباب اختیار یا ان کے سیاسی اور قانونی مشیران کرام ہی جانتے ہوں گے لیکن عام آدمی کو جو سمجھ آتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام اقتدار اور اختیار مارشل لاء حکام کے ہاتھ میں ہو اور اس اقتدار اور اختیار میں نچلے درجے کے فوجی افسران کو بھی شامل کیا جائے خواہ وہ قابلیت کے اعتبار سے اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ فوجی عدالتوں میں بددیانتی در آئی۔ ایک ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل کے مطابق ان عدالتوں میں جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے رشوت کے نرخ مقرر ہو گئے تھے۔ جہاں تک ان فوجی عدالتوں کے سربراہان اور ممبران کی اہلیت کا تعلق ہے لاہور ہائی کورٹ کے

ایک ممتاز فوجداری وکیل نے بیان کیا کہ ایک مقدمہ میں وہ راولپنڈی کی ایک فوجی عدالت میں ایک ملزم کی ضمانت کے سلسلے میں پیش ہوئے۔ جرم قابل ضمانت تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کی ضمانت اس کا قانونی حق ہوتا ہے۔ وکیل صاحب نے اپنا مُوقف بیان کیا اور ضابطہ فوجداری کا حوالہ دیا۔ عدالت کے سربراہ نے ناراض ہو کر پوچھا کہ یہ ضابطہ فوجداری وغیرہ کیا بلا ہوتی ہے۔ وکیل صاحب نے کتاب پیش کی اور مناسب دفعہ بھی بتائی۔ جج صاحب نے مزید پوچھا کہ یہ کتاب کس نے لکھی ہے۔ عرض کیا کہ یہ ملک کا قانون ہے۔ جج صاحب حیران ہوئے اور فرمایا کہ میں سال بھر سے عدالت کر رہا ہوں اور آج یہ کتاب میرے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ میں اس کو پڑھنا چاہوں گا۔ وکیل صاحب نے کتاب بطور تحفہ اپنی طرف سے پیش کی اور اپنے ملزم کو ضمانت پر رہا کرا کر عجلت میں عدالت سے رخصت ہوئے۔

پی سی او کا آرٹیکل ۱۴ جو سیاسی جماعتوں کے متعلق ہے مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) جب صدر کی جانب سے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی جائے گی تو صرف وہی کالعدم پارٹیاں اس میں حصہ لے سکیں گی جنھوں نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء تک الیکشن کمیشن میں رجسٹریشن کروا رکھی ہو یا جن کو الیکشن کمیشن سیاسی عمل کی اجازت دے چکا ہو۔

(۲) اوپر بیان کی ہوئی پارٹیوں کے علاوہ اور تمام سیاسی پارٹیاں کالعدم تصوّر ہوں گی اور ان کی املاک بحق سرکار ضبط کی جائیں گی۔

(۳) اس حکم کے بعد کوئی نئی سیاسی پارٹی معرض وجود میں نہیں آ سکے گی الّا کہ الیکشن کمیشن اس کو اجازت دے۔

(۴) اگر صدر کو باور ہو کہ کوئی سیاسی پارٹی معرض وجود میں آئی ہے یا پہلے سے موجود ہے اور اس طرح سے کام کر رہی ہے کہ اسلامی نظریہ کو ٹھیس پہنچے یا پاکستان کی سالمیت یا ریاست کو کوئی گزند ہو تو صدر چیف الیکشن کمشنر کے مشورے سے اس پارٹی کو ختم کر سکتا ہے۔

پی سی او کی اس قدر سخت پابندی عائد کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ کوئی سیاسی جماعت کام نہ کر سکے اور ملک میں سیاسی عمل ختم ہو جائے' کیونکہ اگر سیاسی عمل شروع ہو گیا تو لامحالہ ایک ہی مطالبہ ہو گا اور وہ یہ اب جبکہ اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں ہے تو مارشل لاء ختم کیا جائے۔ لہٰذا اس قانون نے پوری قوم کو باندھ کر رکھا ہوا تھا۔ جسٹس درآب پٹیل نے ان حالات کو اپنے ایک دو حرفی بیان میں جو رسالہ NAG ۱۰ جنوری ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا' اس طرح بیان کیا

"ہم ایک طویل اور تاریک سرنگ میں ہیں' جس کے آخری کنارے پر بھی کوئی روشنی دکھائی نہیں

دینی۔ کسی شخص کو معلوم نہیں کہ کل کیا ہو گا"۔

ریفرنڈم اور الیکشن

۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کو صدر ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ ملک میں مارچ ۱۹۸۵ء میں عام انتخابات ہوں گے' مارشل لاء اٹھا دیا جائے گا اور سول حکومت قائم کی جائے گی۔ اتنا لمبا ٹائم ٹیبل کیوں دیا گیا اس کی وضاحت کی تکلیف نہیں فرمائی۔ عوام اس پروگرام کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے' کیونکہ جنرل ضیاء الحق کے وعدوں کا ریکارڈ اتنا اچھا نہیں تھا۔ لیکن عوام کر بھی کیا سکتے تھے۔ قہر درویش بر جان درویش والا معاملہ تھا۔ بیشتر سیاسی راہنما نظر بند یا جلاوطن تھے اور ملک میں کوئی ایسا فرد یا جماعت نہیں تھی جو مارشل لاء کے اس لامتناہی سلسلے کے خلاف عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا یا ان کے احتجاج کو منظم کرتا۔ حکومت حسب دستور اپنے موقف کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو سختی سے دبانے کو تیار تھی۔

وقتاً فوقتاً چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے بیان آتے رہتے تھے کہ صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں بہت تفاوت ہے جس کو دور کرنے کیلئے آئین میں ترمیم ہونی چاہئے تاکہ ان دونوں کے اختیارات میں ایک توازن رہے۔ حکومت میں کسی جماعت کا دخل نہیں ہونا چاہئے اور الیکشن میں سیاسی پارٹیاں نہیں بلکہ افراد اپنی نجی حیثیت میں حصہ لیں اور کم از کم ۱۹۸۵ء کے الیکشن تو سیاسی پارٹیوں کے بغیر ہو۔ اس کے بعد قومی اسمبلی کی صوابدید پر ہے جو فیصلہ وہ کرے۔ علاوہ بریں چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کا ایک عرصہ سے یہ بھی مؤقف تھا کہ ملک میں قومی اسمبلی کے بھی اوپر ایک تنظیم جس کا نام سلامتی کونسل ہو' ہونی چاہئے۔ اس کونسل میں صدر' وزیر اعظم اور بحری۔ بری اور ہوائی افواج کے سربراہ ممبران ہوں۔ یہ کونسل فیصلہ کرنے کی مجاز ہو گی کہ ملک کے حالات کے تحت حکومت میں تبدیلی لازم ہے۔ مراد یہ کہ مارشل لاء لگایا جانا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ قومی اسمبلی سے بالا اس سلامتی کونسل کا فیصلہ اسمبلی پر لاگو ہو گا اور ملک میں مارشل لاء ایک جرنیل کی مرضی سے نہیں بلکہ ملک کی سول انتظامیہ اور افواج کے سربراہوں کے فیصلے سے لگے گا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب لگ گیا تو پھر اس کو ہٹانا فقط فوجی سربراہوں ہی کی رضا سے عمل میں آئے گا۔ جہاں تک مارشل لاء ہٹانے یا اٹھانے کا سوال ہے ملک اور قوم اس عمل کا کافی تجربہ رکھتے ہیں۔

صدر اور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر نے ان معاملات کے علاوہ اور اضافی معاملات میں اپنے مؤقف کو ملک کے سیاسی اتار چڑھاؤ کے مطابق اکثر تبدیل کیا۔ اکثر اوقات سکیورٹی کونسل یا سلامتی کونسل پر بیحد زور دیا اور اس کی افادیت کی تعریف کی۔ کبھی کبھی یہ بھی کہا کہ ملک کے آئینی نظام میں افواج کا کوئی کردار نہیں ہو گا۔ بھارت کی جنتا پارٹی کے لیڈر مسٹر سبرامنیم کو انٹرویو دیتے ہوئے چیف مارشل لاء



بھٹو بحیثیت وزیر اعظم۔ عوامی جمہوریہ چین کے دورے پر وزیر اعظم چین کے ساتھ

ایڈمنسٹریٹر نے واضح اور دوٹوک طور پر کہا کہ

"پاکستان کے آئینی نظام میں افواج پاکستان کا کوئی آئینی رول یا کردار نہیں ہو گا اور میں (صدر ضیاءالحق) سول حکومت میں کسی عہدے کیلئے امیدوار نہیں ہوں گا۔ یہ بیان ۹ دسمبر ۱۹۸۳ء کے شمارہ جنگ میں شائع ہوا"۔

یہ ذومعنی مؤقف ایک سوچی سمجھی سکیم کے مطابق اختیار کیئے جاتے تھے۔ دراصل مارشل لاء حکام کی سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ ان کو کوئی ایسا راستہ نظر نہیں آتا تھا جس کے ذریعے وہ آئین بحال کر کے ایک سول انتظامیہ کے روپ میں اپنا اقتدار جاری و ساری رکھ سکیں۔ ظاہر ہے کہ عام انتخاب میں کسی ایک فوجی حاکم کو بھی عوام کی تائید حاصل نہ ہوتی اور نہ ہی کوئی منتخب ہو سکتا۔ جیسا کہ حمزہ علوی نے کہا ہے،

"فوجی نفری ہی دراصل جنرل ضیاء کے حق میں ووٹ ڈالنے والی جماعت (CONSTITUENCY) ہے اور دیگر عوام میں اور کوئی نہیں۔ ضیاءالحق کی حکومت دراصل ملک میں پہلی صحیح معنوں میں فوجی حکومت ہے۔ ایوب اور یحییٰ خان کی حکومتوں کو یہ درجہ حاصل نہیں تھا۔ فوجی طاقت کے بل پر حکومت کرنا اقتدار کی بنیاد کے لحاظ سے بہت کمزور اساس ہے۔ اس حکومت کا انحصار کلیتاً فوجی طاقت پر ہے اور جس طریقے سے فوج میں بددیانتی کا عنصر داخل ہوا ہے مارشل لاء کو فوج کی حمایت میسر رہے گی۔ یہی ایک مہذب معاشرے میں اس کی کمزوری کی علامت ہے۔ اس حکومت کا ظالمانہ روّیہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ اپنے لئے قانونی شناخت حاصل کرنے میں قاصر رہی ہے۔ مخالفین پر خوف طاری کرنے کے حربے بتاتے ہیں کہ اسے عوام میں مثبت حمایت حاصل نہیں ہو سکی"۔

۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کو جنرل ضیاءالحق نے ایک مختصر المیعاد ریفرنڈم کرایا جس میں سوال یہ تھا کہ کیا پاکستان کے عوام چاہتے ہیں کہ ملک میں اسلامی نظام قائم ہو۔ اگر جواب مثبت ہو تو سمجھا جائے گا کہ انہوں نے جنرل ضیاءالحق کو پانچ سال کیلئے صدر چن لیا ہے۔ انٹیلی جنس ایجنسیوں کی اطلاع تھی کہ عوام کا ردّعمل اچھا نہیں ہو گا۔ چنانچہ بہت سے اقدامات کئے گئے۔ مثلاً تمام افواج، تمام نیم فوجی تنظیمیں، سول ملازمین اور لوکل باڈیز وغیرہ کے ملازمین سب سے ہی قبل از وقت ڈاک کے ذریعے ووٹ ڈلوائے گئے۔ مجلس شوریٰ کے نامزد ممبران کو اپنے اپنے علاقے میں بھیجا گیا کہ جا کر عوام میں ریفرنڈم کے متعلق راہ ہموار کریں اور ووٹ ڈلوائیں۔ میں نے خود ایک شخص سے جو موقع پر موجود تھا سنا کہ ڈیرہ غازیخان میں ایک وزیر جو سابقہ فوجی بھی ہیں عوام کو ایک جلسے میں ترغیب دے رہے تھے کہ ہر شخص کم از کم پچاس یا

ساٹھ ووٹ ڈالے اور کہا کہ وہ خود کسی پچھلے الیکشن میں ایسا کر چکے ہیں۔ ریفرنڈم سے ایک شام قبل صدر ضیاء الحق نے اعلان کر دیا کہ ووٹ ڈالنے کیلئے شناختی کارڈ کی ضرورت نہیں ہو گی۔ یہ اعلان چونکہ چیف الیکشن کمشنر کو اطلاع دیئے بغیر کیا گیا' ان موصوف نے اس پر حیرت کا اظہار کیا جو باقاعدہ اخباروں میں چھپا۔ ان تمام اقدامات و عوامل کے باوجود ریفرنڈم کے دن بہت کم لوگ ووٹ ڈالنے کیلئے آئے۔ محتاط اندازوں کے مطابق دس فیصد سے زیادہ لوگوں نے ووٹ نہیں ڈالا۔ لیکن ذرائع ابلاغ اور چیف الیکشن کمشنر نے بڑھا چڑھا کر کہا کہ ۶۰ فیصد سے زیادہ عوام کے ووٹ ڈالے گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے فوری اعلان کر دیا کہ عوام نے انہیں پانچ سال کیلئے صدر منتخب کر لیا ہے اور آئین میں ترامیم کرنے کا حق بھی دے دیا ہے۔ یہ عجیب اور انوکھا انداز جس کے ذریعے ایک قطعی لاتعلق امر کو بروئے کار لا کر الیکشن کا نام دے دیا گیا شہروں اور گلی کوچوں میں ایک مذاق بن کر رہ گیا۔ لیکن صاحب صدر پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔

ریفرنڈم کے فوراً بعد کے شمارے میں (ECONOMIST) لندن نے لکھا۔

> "دسمبر میں جنرل ضیاء نے ایک ریفرنڈم کرایا جس کے ذریعے اس نے اپنے آپ کو اسلام کے داعی کی حیثیت سے پانچ سال کیلئے صدر پاکستان بنا لیا۔ اس کارگزاری میں اتنے بھونڈے طریقے سے دھاندلی کی گئی کہ اشتراکی حکومتیں بھی ایسے اقدام سے شرما جائیں"۔

لہٰذا جنرل صاحب نے اپنا مقام متعین کرنے کے بعد اعلان کیا کہ انتخابات برائے قومی اسمبلی ۲۵ مارچ اور صوبائی اسمبلیاں ۲۸ مارچ کو ہوں گے۔ مزید کہ یہ انتخابات غیر جماعتی بنیاد پر ہوں گے۔ عوام میں اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا لیکن بے سود اور انتخابات اسی طرح ہوئے جیسے حکم ہوا تھا۔

باوجود اس کے کہ سیاسی جماعتوں نے اور ایم آر ڈی MOVEMENT FOR RESTORATION OF DEMOCRACY نے الیکشن کے بائیکاٹ کی اپیل کی' عوام کثیر تعداد میں ووٹ ڈالنے آئے۔ ان کا جوش و خروش ان کے صحیح جذبات کا آئینہ دار تھا۔ پاکستان کے عوام نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ وہ سیاسی شعور رکھتے ہیں جب انہوں نے ریفرنڈم کی اصلیت کو بھانپ کر باوجود ہزار کوششوں کے ووٹ ڈالنے سے انکار کیا لیکن جب انتخابات ہوئے تو جوق در جوق نکلے اور اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ ریفرنڈم ایک چال تھی جس کی حمایت انہوں نے نہ کی۔ انتخابات ایک کھلا اور واضح راستہ تھا جس پر چل کر وہ آج نہیں تو کل آزادی اور جمہوریت کی منزل تک پہنچ سکتے تھے۔ اس لئے سیاسی جماعتوں اور ایم آر ڈی کی اپیل ان کو مانع نہ آ سکی حالانکہ ملک کے بیشتر عوام کسی نہ کسی جماعت سے منسلک ہیں۔

جہاں تک ریفرنڈم کا تعلق ہے جو سوال اس میں کیا گیا تھا' بے معنی تھا۔ پاکستان یا کسی بھی اسلامی ملک کے لوگ کیسے کہہ سکتے تھے کہ ہم اسلامی طرزِ حیات یا طرزِ حکومت کے خلاف ہیں۔ اور ان کا یہ کہنا کہ ہم اس کے حق میں ہیں کیسے ثابت کرتا ہے کہ جنرل ضیاءالحق پانچ سال کیلئے صدر پاکستان ہو گئے۔ دونوں باتوں میں کوئی تعلق رشتہ نہیں ہے۔ اب کہا جا رہا ہے اور خود صاحب صدر بار بار فرما رہے ہیں کہ اب ملک میں اسلامی نظام رائج کرنا منتخب حکومت کا کام ہے۔ خوب شد۔ آپ کی اپنی منطق کے مطابق عوام نے آپ کو ملک میں اسلامی نظام رائج کرنے کیلئے ووٹ دیا نہ کہ وزیر اعظم جونیجو کو۔ اب آپ اسلام کا جوا اپنے گلے سے اتار کر وزیر اعظم جونیجو کے گلے میں ڈال رہے ہیں۔ یا شاید اب ارادہ ایک اور ریفرنڈم کا ہو کہ یہ سول حکومت تو اسلام لانے میں ناکام رہی ہے لایئے میں اگلے پانچ برس میں طوعاً و کرہاً آپ کیلئے اسلامی نظام لا ہی دوں۔ بیچارا اسلام!

احیائے آئین

منتخب اسمبلی کے پہلے اجلاس کے انعقاد سے پہلے ہی جنرل ضیاءالحق نے آرڈر نمبر۱۶ مجریہ ۲ مارچ ۱۹۸۵ء سے احیائے آئین ۱۹۷۳ء جاری کر دیا۔ اس حکم نامے سے آئین میں بہت سی نمایاں ترامیم کر دی گئیں۔ ہر شخص کی زبان پر یہی سوال تھا کہ اب جبکہ ملک میں عام انتخابات ہو گئے ہیں' ایک قومی اسمبلی تشکیل ہو چکی ہے اور ملک کے آئین میں ترمیم کرنا خالصتاً اس اسمبلی کے فرائض میں شامل ہے تو پھر ایک یا دو ہفتے پہلے اتنی دوررس ترامیم کس لئے کی گئیں اور کونسی ہنگامی حالت یا مجبوری کے تحت کی گئیں۔ سوال اپنی جگہ برحق لیکن صدر پاکستان' جنرل ضیاءالحق نے شانِ استغنا سے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا کہ ایسا کرنا ضروری نہ تھا۔

فہرست ترامیم جو آر سی او نے کیں قدرے طویل ہے لیکن اس کی چند شقیں جو ہماری بحث سے متعلق ہیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۵) مشکلات کا دور کرنا۔

(i) اگر اس آرڈر کی کسی مد (PROVISION) کو لاگو کرنے میں کوئی مشکل پیش آئے تو صدر اس مشکل کو حل کرنے کیلئے کوئی دوسری مد یا دوسرا حکم جاری کر سکتا ہے۔

(ii) کسی کو اختیار نہیں ہو گا کہ صدر کی جاری کردہ متبادل مد یا حکم کی قانونی حیثیت کے متعلق کوئی سوال اٹھائے۔

(iii) آرٹیکل ۲۳۹ یا آئین کے کسی بھی اور آرٹیکل سے قطع نظر'

۱۹ دسمبر ۱۹۸۴ء کے ریفرنڈم کے نتیجے میں منتخب ہو کر جنرل محمد ضیاء الحق پاکستان کے صدر ہوں گے۔ صدارت کی مدت منتخب مجلس شوریٰ (پارلیمینٹ) کی پہلے اجلاس کے انعقاد کے دن سے شروع ہو گی اور پانچ سال تک رہے گی اور آرٹیکل ۴۴ اور آئین کی دوسری متعلقہ شقیں لاگو ہوں گی۔

(نوٹ آرٹیکل ۴۴ میں صدر کی مدت عہدہ کا ذکر ہے اور یہ بھی کہ صدر اس مدت کے بعد دوبارہ صدارت کا امیدوار ہو سکتا ہے)

(۴۸) (i) صدر اپنے اختیارات کے استعمال میں وزیر اعظم اور وزارت کے مشورے پر عمل کرے گا۔

بشرطیکہ اگر صدر چاہے تو کسی مشورے کو دوبارہ غور کرنے کیلئے وزارت کو لوٹا سکتا ہے اور جب بار دیگر غور کرنے کے بعد معاملہ صدر کے پاس جائے گا تو صدر اس پر عمل کرے گا۔

(ii) اوپر کی شق (۱) CLAUSE کے قطع نظر صدر کسی معاملے میں بھی، جس میں وہ آئینی اختیارات رکھتا ہے، اپنی صوابدید کے مطابق عمل یا فیصلہ کر سکتا ہے۔

(iii) اگر یہ سوال پیدا ہو کہ کوئی معاملہ صدر کے آئینی اختیارات میں شامل ہے یا نہیں تو اس کا فیصلہ صدر کی صوابدید پر ہو گا اور یہ فیصلہ حرف آخر ہو گا۔ نیز کسی کو اختیار نہیں ہو گا کہ وہ صدر کے کسی ایسے فیصلے یا اقدام کو اس بنیاد پر چیلنج کرے کہ صدر کا ایسا کرنا مناسب نہ تھا یا نہیں۔

(۹۱) کیبنٹ CABINET

وزارت ایک کیبنٹ کی شکل میں ہو گی اور وزیر اعظم اس کا سربراہ ہو گا۔ یہ کیبنٹ صدر کے اختیارات کے استعمال میں اس کی امداد کرے گا اور مناسب مشورے دے گا۔

(۹۹) وفاقی انتظامیہ کا طرز حکومت

(i) وفاقی انتظامیہ کے تمام احکام صدر کے نام سے جاری ہوں گے۔

(ii) صدر قواعد وضع کرے گا جن کے مطابق تمام احکام اور دستاویزات جو اس کے نام سے جاری ہوں گی، کی توثیق ہو گی اور کسی عدالت کو اختیار نہیں ہو گا کہ صدر کے نام سے جاری کئے کسی حکم کے خلاف اس امر پر سماعت کرے کہ خود

صدر نے وہ حکم جاری کیا تھا یا نہیں۔

(اے۔ ۱۵۲) قومی سلامتی کونسل

(i) ایک قومی سلامتی کونسل قائم کی جائیگی۔ آئین کے آرٹیکل ۲۳۲ کے تحت ہنگامی حالات کا اعلان کرنا یا کسی اور معاملہ میں جو قومی اہمیت رکھتا ہو اور جس پر صدر یا وزیر اعظم ان سے مشورہ طلب کرے۔ قومی سلامتی کے دائرہ اختیار میں ہو گا کہ وہ ایسا اعلان کرے یا مشورہ کرے۔

(ii) قومی سلامتی کونسل میں شامل ارکان صدر، وزیر اعظم، چیئرمین سینٹ SENATE، چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف JOINT CHIEFS OF STAFF، بّری، بحری اور ہوائی افواج کے سربراہ اور صوبوں کے وزیر اعلیٰ ہوں گے۔

یہ ترامیم جو منتخب اسمبلی کے پہلے اجلاس کے انعقاد سے ایک یا دو ہفتے قبل کی گئیں، آمرانہ، غیر جمہوری اور قطعی غیر اسلامی تھیں۔ ہر وہ شخص جو باضمیر ہے اور سیاسی شعور رکھتا ہے ان پر رنجیدہ خاطر ہوا اور لوگوں نے جی بھر کے تنقید کی۔ ۲۲ مئی ۱۹۸۵ء کے شمارہ جنگ میں بیرسٹر فاروق حسن نے ایک مقالے میں لکھا۔

"قانون اور آئین کی تفسیر INTEPRETATION ہمیشہ سے عدالتوں کا منصب رہا ہے۔ آرٹیکل ۵ کے تحت صدر نے یہ اختیار خود لے لیا ہے۔ آرٹیکل ۴۸ میں صدر اس امر کا واحد ثالث ہے کہ اس کی صوابدید درست ہے یا نہیں اور عدالتوں کا یہ اختیار بھی چھین لیا گیا ہے۔ تیس اور چالیس کے عشروں میں فسطائی جرمنی اور اٹلی میں ایسے بے مہار اختیارات آمروں کو بھی حاصل نہیں تھے۔ بیرسٹر فاروق حسن نے موازنہ کرتے ہوئے کہا کہ خلفائے راشدین نے کبھی اپنے کردار کی چھان بین میں قانون اور عدالت سے پہلوتہی نہیں کی تھی۔"

جسٹس ریٹائرڈ شیخ عطاء اللہ سجاد نے نوائے وقت کے ۲۲ مارچ ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو میں صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات کے توازن کے مؤقف کو قابل اعتراض سمجھا۔ انہوں نے کہا کہ

"جو جمہوری حکومت پاکستان کے عوام پسند کرتے ہیں اس میں وزیر اعظم ہی تمام اختیارات کا حامل ہوتا ہے کیونکہ وہ ایوان کے ذریعے عوام کو جوابدہ ہوتا ہے جو کہ صدر نہیں ہوتا۔ ایوان کو ہمیشہ اختیار ہوتا ہے وہ جب چاہے، کسی معاملے میں

بھی وزیر اعظم کی جواب طلبی کرے اور اگر اس نے کوئی اقدام عوامی مفاد کے خلاف کیا ہے تو اس کا احتساب کرے"۔

جج صاحب نے قومی سلامتی کونسل پر بھی نکتہ چینی کی اور کہا "یہ قومی اسمبلی کی بالادستی پر دست درازی ہے جو کہ اسلامی جمہوری اقدار کے منافی ہے۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے عہد کے ایک واقعہ کا ذکر بھی کیا کہ جب خالد بن ولید جیسا بہادر فاتح اپنی کسی لغزش کیلئے زنجیروں میں جکڑا ہوا عدالت کے سامنے لایا گیا تھا۔

مشہور قانون دان اعتزاز احسن نے ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء کے جنگ کے شمارے میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ۔

"یہ ترامیم عام اور معمولی اہمیت کی نہیں ہیں بلکہ یہ آئین کے بعض اہم آرٹیکل منسوخ کرتی ہیں اور ان کی جگہ بالکل نئے اور ایسے آرٹیکل لاتی ہیں جو آئین کی روح کو کچل دیتے ہیں اور اس کے مسلک ہی کو بدل دیتے ہیں لہٰذا آئین میں محض ترامیم ہی نہیں آئین کا مفہوم اور CONCEPT ہی تبدیل کر دیا گیا ہے"۔

محمد اشرف کاہلوں نے ۲۰ اپریل ۱۹۸۵ء کے جنگ کے شمارے میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ۔

"جمہوری ریاست میں عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ دونوں پر احتساب کی نظر رکھتی ہے۔ مارچ ۱۹۸۵ء کی آئینی ترامیم نے صدر کو عدلیہ سے بالا کر دیا ہے اور تمام تر اختیارات اس کو تفویض کر دیئے ہیں' لہٰذا عدلیہ سے اس کا احتسابی کردار چھین لیا گیا ہے۔ ۱۹۷۳ء کا آئین پوری قوم کے متفق ہونے کی دلیل تھا اور اس کی شقیں اس طرح سے مرتب ہوئی تھیں کہ دوبارہ ایوب خان اور یحییٰ خان جیسے آمر اقتدار پر قبضہ نہ کرلیں۔ یہ ترامیم تو ایوب اور یحییٰ کے آئین سے بھی زیادہ آگے نکل گئی ہیں۔ نتیجتاً پارلیمنٹ صرف صدر کی ایک مشاورتی کونسل بن گئی اور اس کا اعلیٰ کردار ختم ہو گیا ہے۔

بھارت کی سپریم کورٹ نے حال ہی میں ایک مقدمہ بعنوان **کیشوا** نند بنام سرکار میں **فیصلہ** دیتے ہوئے کہا ہے کہ۔

"پارلیمنٹ کو بھی اختیار نہیں ہے کہ آئین میں کوئی ایسی ترمیم کرے کہ جس سے آئین کا CHARACTER ہی بدل جائے۔ اگر پارلیمنٹ یا عوام سمجھتے ہیں کہ کسی ایسی ترمیم کی ضرورت ہے تو پھر ایک آئین ساز اسمبلی بلانی ضروری ہے (جو ہمہ

وقت اسی کام پر توجہ دے) اور یہ آئین ساز اسمبلی بھی باقاعدہ عوام کی منتخب کردہ ہو"۔

مولانا شاہ احمد نورانی کا بیان بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ فرماتے ہیں کہ۔

"مارچ ۱۹۸۵ء میں کل ۵۶ ترامیم آئین میں کی گئیں۔ ان میں سے ایک کے سوائے اور کوئی ترمیم ایسی نہیں جس کا تعلق فروغ اسلام یا اسلامی نظام حکومت سے ہو۔ سب کی سب صدر کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے کیلئے کی گئیں' عدالتوں کے اختیارات چھین لئے گئے' عوام کے بنیادی حقوق سلب کئے گئے اور اسمبلیوں کو بے اختیار کر دیا گیا"۔

ایک ترمیم جس کا تعلق اسلام سے ہے وہ قرارداد مقاصد OBJECTIVES RESOLUTION کا آئین میں شامل کیا جانا ہے اور یہ قرارداد مقاصد بھی ۱۹۵۶ء کے آئین سے لی گئی ہے۔ مولانا صاحب نے مزید کہا کہ اگر ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء نہ لگایا جاتا اور ۱۹۷۳ء کا آئین بحال رہتا تو اس آئین کی رو سے اب تک ملک میں اسلامی نظام حکومت قائم ہو گیا ہوتا۔ یہ بیان جنگ کے ۱۱ جولائی ۱۹۸۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

اسلام میں ریاست اور حکومت کا تصور تو نمائندہ حکومت' قانون کی بالادستی مساوات جس میں شاہ و گدا سب قانون کے سامنے برابر ہیں' پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو اسلام ہمارے حکمران لانا چاہتے ہیں وہ قدرے مختلف ہے یا پھر قطرہ قطرہ تیرے دیدار کی شبنم کی طرح برسے گا۔ ورنہ فی الحال تو تیرے امیر مال مست اور تیرے فقیر حال مست ہی نظر آتے ہیں اور بندہ بدستور کوچہ گرد ہے اور خواجہ بلند بام۔

یہ ترامیم قومی اسمبلی میں زیر بحث آئیں۔ کچھ دھواں دھار تقریریں بھی ہوئیں اور پھر ان کا شین قاف درست کرنے کے بعد پاس ہو گئیں۔ جیسا کہ بیرسٹر اعتزاز احسن نے کہا انہوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین کا مسلک ــــــ ہی تبدیل کر دیا ہے۔ ملک کی سالمیت پر جو چوٹ اس وجہ سے پڑی ہے وہ اظہر من الشمس ہے کیا جی ایم سید اور کیا ولی خان قبلہ سب کھل کر پاکستان کے وجود پر ہی معترض ہیں۔

۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے آئینوں کی منسوخی' بنیادی جمہوریت ایکٹ' پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ' یحییٰ خان کے آئین کا ڈرافٹ' PROVISIONAL CONSTITUTION ORDER یا پی سی او REVIVAL OF CONSTITUTION ORDER یا آر سی او' ۱۹۷۳ء کے آئین میں ترامیم' ریفرنڈم' غیر جماعتی انتخابات وغیرہ مختلف مارشل لاء کی حکومتوں کے وہ اقدام ہیں جو انہوں نے مستقلاً اقتدار میں رہنے کیلئے کئے۔ ایسا کرنے میں اگر ان کو عوام کے بنیادی حقوق کو پامال کرنا پڑا تو انہوں نے بلا تامل کیا۔

مختصراً یہ کہ یہ تمام عوامل عوام کے خلاف کارروائیاں کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن مارشل لاء حکام کو یہ عوامل نہایت منصفانہ نظر آتے ہیں کیونکہ یہ ان کے اپنے مفاد میں ہیں۔ البتہ کسی نہ کسی موقع پر ناکامی ان کے کھوکھلا پن کو ظاہر کر دیتی ہے اور وقت کا دھارا ان نام نہاد قوانین اور آئینوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا ہے۔

جیسا کہ ایوب اور یحییٰ کے قوانین اور آئینوں کے ساتھ ہوا۔ تیسرے اور ابھی تک آخری مارشل لاء کے عوامل ابھی تک مرکزی سٹیج سنبھالے ہوئے ہیں اور عوام دیکھتے اور انتظار کرتے چلے جا رہے ہیں۔

می نگریم و می رویم

مارشل لاء کا سیاسی انداز

برصغیر جو اس وقت ہندوستان اور پاکستان پر مشتمل ہے، اس کی تاریخ بڑی رنگین رہی ہے۔ یہ سرزمین ہمیشہ زرخیز تھی اس لئے حملہ آوروں، لٹیروں اور آباد کاروں کی آماجگاہ بنی رہی۔ حملوں کا آغاز شاید آریاؤں نے ۱۵۰۰ قبل مسیح کیا۔ ان کے بعد ایرانی ۵۰۰ ق م میں آئے۔ یونانی، وسط ایشیائی اور اسی عرصہ میں HUNS بھی آئے۔ ۷۱۲ عیسوی میں عرب اور اس کے بعد ترک، منگول، افغان اور بالآخر مغل آئے۔ ان میں سے آخر میں آنے والے یعنی مغل یہاں مستقل رہائش پذیر ہوئے اور انہوں نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ ان مغلوں کی سلطنت تمام برصغیر پر پھیلی ہوئی تھی اور تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ ایک ہی ملک کی بنیاد پر مغلیہ بادشاہوں کی مملکت بنا۔ مغل مذہباً مسلمان تھے۔ ان کا دور حکومت تقریباً چار سو برس تک رہا۔ پھر سہل کوشی اور تعیش نے انہیں اتنا کمزور کر دیا کہ ایک تیسری طاقت، برطانیہ نے جو تاجر بن کر ملک میں وارد ہوئے تھے، مغلوں کی حکومت کی بساط الٹ دی اور خود اس سرزمین کے حکمران بن گئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے اس ملک کے باشندوں پر مذہب کے نام پر کبھی استبداد روا نہیں رکھی۔ کبھی کسی کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ مقامی آبادی میں سے ہندو، بدھ مت کے پیرو یا دیگر کسی بھی مذہب کے لوگ جنھوں نے اسلام قبول کیا، یہاں آنے والے اولیاء کرام اور بزرگوں کی اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر کیا۔ ہندو جو ملک میں اکثریت میں تھے، مغلوں کی انتظامیہ میں اکثر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے، فوج میں داخل ہوتے تھے اور بسا اوقات دونوں شعبوں میں اعلیٰ ترین منصبوں تک ترقی کرتے تھے۔ جب تک مسلمان حکمران امور ریاست و سیاست میں مضبوط اور با اثر رہے ان کی ہندو رعایا وفادار رہی اور ملک میں امن رہا۔ جب مغل بادشاہت زوال پذیر ہوئی تو جگہ جگہ بغاوت نے سر اٹھایا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی سے مغل اقتدار کا شیرازہ بکھرنے لگا اور برطانیہ کی

ایسٹ انڈیا کمپنی ملک کے مختلف حصوں پر قابض ہوتی چلی گئی۔ انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں کمپنی اتنی طاقت میں آ چکی تھی کہ اس کی نظریں ملک کی بادشاہت پر جم گئیں۔ اونچے درجے کے شاطر ہونے کے باوصف انہوں نے ہندوستان کو ہندوستانی دولت اور ہندوستانی سپاہ سے فتح کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ ہندو جو انگریز کی یورش کے سامنے کھڑے ہونے کے قابل نہ تھے' انگریزوں سے مل گئے اور دونوں نے مسلمان سلطنت کو اپنا ہدف بنایا۔

دور انگلیشیہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ ناروا سلوک کیا گیا۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے' تجارت میں سے ان کو نکال باہر کیا اور اعلیٰ تعلیم سے بھی دور رکھا گیا۔ انگریزوں کی یہ پالیسی اس لئے بھی تھی کہ وہ مسلمانوں کو معزول کر کے حکومت پر قابض ہوئے تھے اس لئے مسلمانوں پر بھروسہ کرنا بعید از عقل سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں ہندو زیادہ تابع فرمان اور زمانہ ساز تھے۔ چنانچہ ہندوؤں نے انگریز کی سرپرستی میں ہر میدان میں ترقی کی جبکہ مسلمان من حیث القوم قعر ذلت میں گرتے چلے گئے۔ پھر ایکا ایکی سر سید احمد خان جیسے صاحب نظر پیدا ہوئے جنھوں نے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا' مرض پہچانا اور علاج اس تحریک سے شروع کیا جو REVIVALIST MOVEMENT کہلاتی ہے۔ یعنی کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کے لئے غم و غصہ نہیں علم کی طاقت کا حصول قومی شعار بنانے کی تحریک' اس تحریک نے مسلمانوں کو بیدار کیا' حالات و حقائق سے روشناس کرایا' ان کی پسماندگی کا احساس دلایا اور بحیثیت ایک قوم ان کی علیحدہ شناخت کی ضرورت ان کے دلوں میں اجاگر کر دی۔ یہی وہ تحریک تھی جو بالآخر پاکستان کے مطالبے کی اساس بنی۔

پاکستان کی تخلیق

حالیہ صدی کے اوائل میں ایک تحریک آزادی نے جنم لیا جس میں باوجود باہمی اختلافات کے ہندو اور مسلمانوں نے انڈین نیشنل کانگرس کے جھنڈے تلے متحد ہو کر جدوجہد میں حصہ لیا۔ انڈین نیشنل کانگرس بظاہر تو ایک غیر دینی SECULAR جماعت تھی اور ملک کے عوام بشمول ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی اور دیگر مذاہب کے پیروؤں کے' سب کے لئے اس کے دروازے کھلے تھے' ذات' رنگ' نسل اور مذہب کا ظاہری طور پر کوئی امتیاز نہیں تھا۔ لیکن انگریزوں کے خلاف تحریک کے اوائل میں ہی کانگرس کے اس SECULARISM کے دعوؤں کا پول کھل گیا۔ دیکھا گیا کہ درون خانہ یہ پارٹی ہندومت اور اس کی قدیمی روایات و قصص میں اس قدر الجھی ہوئی ہے کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری پر بھی مائل نہیں۔ جب سن (۱۹۰۵ - ۱۱) کے دوران انگریزوں نے بنگال کے صوبے کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا تو کانگرس نے اس تقسیم کے خلاف تحریک چلائی۔ اس تحریک میں تمام تر احتجاجی نعرے ہندو مذہب کے منتروں اور

دیوتاؤں کی پرستش کے گیتوں کی شکل میں لگائے گئے۔ بھارتی قومیت کے دلدادہ مسلمان لیڈروں کو یہ حرکت بہت شاق گزری اور انہوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ جب کانگرس کے اعلیٰ سربراہوں نے اس احتجاج کو رد کر دیا تو یہ مسلمان لیڈر کانگرس کی اس تحریک سے الگ ہو گئے۔ عظیم ہندوستانی لیڈر موہن داس کرم چند گاندھی بلاشبہ فرقہ پرستی پر مبنی تشدد کا مخالف تھا بلکہ وہ سیاست میں بھی تشدد کے خلاف تھا اور اس نے انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی کو عدم تشدد کے خطوط پر ہی وضع کیا۔ لیکن اس کا سیاسی کردار' رویّہ' اور طرزِ عمل یکسر ایک ہندو لیڈر کا تھا۔ اس کی تقاریر میں ہندو مذہب کے ماضی' ہندو نظریات' ہندو استعارات کی چھاپ صاف دکھائی دیتی تھی۔ عدم تشدد کی پالیسی کو بھی وہ ہندو مذہب کے ارکان میں ہی ڈھونڈتا نظر آتا تھا۔

علاوہ بریں جیسے وقت گزرتا گیا یہ انکشاف بھی ہوا کہ درپردہ انڈین نیشنل کانگرس کے انتہاپسند ہندو تنظیموں کے ساتھ گہرے تعلقات ہیں۔ اکثر ہندو انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ بدنام زمانہ مسلم دشمن تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ R.S.S کے بھی ممبر تھے۔ صدی کے دوسرے عشرے میں آر۔ ایس۔ ایس نے ایک نیم فوجی رضاکار فورس تشکیل دی جس کا واضح مقصد فرقہ پرستی کو ایک جنونی سمت دینا تھا۔ آر۔ ایس۔ ایس نے باقاعدہ اور منظم طریقے سے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے۔ جس میں ہدف مسلمانوں کے جان و مال ہوتے تھے۔ آتش زنی کی بیسیوں نہیں سینکڑوں وارداتیں ہوئیں۔ مسلم کشی کے اتنے واقعات ہوئے کہ خود جواہر لعل نہرو نے آر۔ ایس۔ ایس کو ایک فسطائی تنظیم کہا اور اس کی ان حرکات پر لعن طعن کیا۔ ۱۹۳۳ء میں ہندو مہا سبھا نے کانگرس سے رشتہ توڑ لیا کیونکہ اس پارٹی کے مؤقف کے مطابق کانگرس مسلمانوں سے ضرورت سے زیادہ رواداری کا سلوک کر رہی تھی۔

ہندو تعصّب پرستی اور اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ آبادی کے ۲۱ فیصد مسلمانوں کو تحریک آزادی میں تو استعمال کرو لیکن آزادی کے بعد انہیں مکمل طور کچل دو۔ صدی کے اوائل ہی میں یہ راز آہستہ آہستہ مسلمان قیادت پر کھلنا شروع ہو گیا اور یہ بھی کہ ہندوؤں کے ساتھ مفاہمت اور رواداری کے تعلقات استوار کرنا اور مستقبل میں استوار رکھنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو شدّت سے احساس ہوا کہ انہیں الگ سیاسی شناخت قائم کرنی پڑے گی۔ اس وقت کے لیڈران کی فراست قابل تحسین ہے کہ انہوں نے حالات کے تیور کو پہچانا اور ہر قسم کی مخالفت اور دشواری کے باوجود اپنے لئے ایک نیا راستہ نکالا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ ذاتی طور پر اور بھی تحسین کے حق دار ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا اور ان کے لئے ایک علیحدہ ملک کا مطالبہ کیا تاکہ وہاں وہ اپنے مذہب اور ثقافت کے مطابق زندگی گذار سکیں۔

اسی اثناء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی اور سیاسی فضا میں کچھ ایسی تبدیلی آئی کہ دنیا بھر میں نو آبادیاتی نظام کا شیرازہ بکھرنے لگا۔ انگریزی' ولندیزی اور فرانسیسی سلطنتیں سمٹنے لگیں۔ نو آبادیات میں آزادی کی تحریکیں زور پکڑ گئیں اور حکمرانوں کے لئے ان تحریکوں کو گولی بارود سے دبانا ناممکن ہو گیا۔ ہندوستان کو بھی ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کی غلامی سے نجات ملی اور اس آزادی کے ساتھ پاکستان کی ریاست کا ظہور ہوا۔ شاید ان الفاظ میں آزادی کا ذکر یہ تاثر دے گا کہ انگریزوں کو جب اس بات کا ادراک ہوا کہ اب ہندوستان کو زیادہ دیر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رکھنا ممکن نہیں وہ از خود اپنے خیمے اکھیڑ کر چلتے بنے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ ہندوستان کے باشندوں' یعنی ہندو' مسلمان اور دیگر مذاہب کے پیروؤں نے کم وبیش تیس برس کی مسلسل جدوجہد' قید و بند اور طرح طرح کی صعوبتیں سہہ کر اور دیگر ان گنت قربانیاں دے کر اپنا حق آزادی منوایا اور بالآخر آزادی کی منزل کو چھوا۔

کیا پاکستان کی تحریک برصغیر کے مسلمانوں نے محض جذبات کی رو میں بہہ کر شروع کی تھی؟ کیا یہ تحریک ایک سوچی سمجھی سکیم یا چال تھی جس کے ذریعے ہم آزادی کے بعد سودا بازی سے زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کرنا چاہتے تھے؟ کیا یہ چال الٹی پڑ گئی اور ہمیں ایک ایسا ملک سونپ دیا گیا جس میں دشواریاں' تضاد اور لاینحل مسئلے ہماری تقدیر بنے؟ اگر کبھی یہ سوال ہمارے نوجوانوں کے اذہان کو پریشان کرتے ہیں تو ان کا جواب آج کا ہندوستان کھل کر دے رہا ہے' مسلمانوں کے خلاف ایک لامتناہی خون آشام ہنگاموں سے جو ملک کے طول و عرض میں ہو رہے ہیں اور ہوتے رہے ہیں' ہندوستان جہاں مسلمانوں کو دوسرے درجے کے شہری بنا دیا گیا ہے اور جہاں ایک بار پھر ان پر ترقی کی راہیں بند کی جا رہی ہیں' جہاں اتنی بڑی آبادی ہونے کے باوجود مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے اور جہاں آج تک کسی حکومت نے ہندو غنڈوں کو لوٹ مار' آتش زنی' مسلمانوں کی آبروریزی سے روکنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی' جہاں مسلمانوں کو شدھی کے نام پر زبردستی ہندو بنایا جا رہا ہے۔ ہندو قوم کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جو لاوا بھرا ہوا ہے اس کا ایک ہلکا سا شرارہ آنجہانی مسز اندرا گاندھی' وزیر اعظم ہندوستان کی زبان سے نمودار ہوا' جب وہ ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے جشن میں تقریر کر رہی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ آج ہم نے ہزار سال کے مظالم کا بدلہ لے لیا ہے۔ یہ ہزار سال ہندوستان پر مسلمان حکمرانی کا عرصہ ہے۔ یاد رہے کہ بدھ مذہب جس نے سرزمین ہندوستان پر جنم لیا اور تھوڑے ہی عرصے میں تمام مشرق میں پھیل گیا' اپنی ہی سرزمین میں قائم نہ رہ سکا کیونکہ ہندو طبعاً رواداری نہیں' کینہ پرور ہے۔ جب عثمانیہ خلافت ختم ہوئی تو ہندو لیڈروں نے جن میں مہاتما گاندھی بھی شامل تھا' سادہ لوح ہندوستانی مسلمانوں سے ہجرت کروا دی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی تمام مسلمان آبادی ہجرت نہیں کر سکتی تھی لیکن مشورہ دینے والوں کی نیت کا اغماض ضرور ہوتا ہے۔

تقسیم ہند کے وقت مشرقی اور مغربی پاکستان کی مشترکہ آبادی آٹھ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ تقریباً چار کروڑ مسلمان ہندوستان میں رہ گئے تھے۔ مشرقی پاکستان کے الگ ہو جانے کے باوجود آج بھی پاکستان کی آبادی اتنی ہی ہے جتنی پہلے پورے پاکستان یعنی بشمول مشرقی پاکستان تھی۔ اس میں ہماری آبادی میں اضافے کی سالانہ شرح کا بڑا دخل ہے۔ بہر طور اسی شرح پر ہندوستان میں مقیم مسلمانوں کی آبادی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ یہ کثیر تعداد اقلیت ہندوؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ پاکستان کی تخلیق اور اس کی بقاء برصغیر کے مسلمانوں کی بقاء ہے۔ اگر پاکستان مضبوط ہو گا تو ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے بھی سلامتی کی ضمانت بن سکتا ہے اور اگر پاکستان کمزور اور اندرونی انتشار کا شکار ہے تو ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کیا ہی تقویت دے سکتا ہے۔ بدقسمتی سے حالات، جن کا کچھ جائزہ ہم اس باب میں لیں گے، ایسے رہے ہیں کہ پاکستان ہندوستان کے مسلمانوں کے تحفظ کی ضمانت تو کیا بنتا خود آپ ہی بکھر سا گیا۔

تقسیم ہند کی دلدوز داستان بار بار دہرائی جا چکی ہے کہ کس طرح قتل و غارت، لوٹ مار، آبروریزی، آتش زنی اور ہر طرح کی شیطینت کا بازار گرم ہوا۔ اندازے کے مطابق دس لاکھ مسلمان مرد، عورت، بچے اور بوڑھے اس کا شکار ہوئے۔ اتنی بڑی قربانی کے بعد معرض وجود میں آنے والا یہ وطن ظاہر ہے کہ اس کے باسیوں کو بہت عزیز تھا اور ہے۔ جس روز یہ عالم وجود میں آیا، ملکی خزانہ خالی تھا اور لاکھوں بھوکے، ننگے، بیمار، ادھ موئے مہاجر قطار در قطار چلے آ رہے تھے۔ ان کی رہائش، خوراک، دوادارو کسی چیز کا باقاعدہ انتظام نہیں تھا۔ لیکن ان ناگفتہ مصائب کے باوجود یہ لٹے پٹے مہاجر سرحد پار کرتے تو خدائے باری تعالیٰ کے سامنے سجدے میں گر پڑتے کہ اس ذات پاک نے انہیں ایک وطن بخشا جسے وہ اپنا وطن کہہ سکتے تھے۔ ادھر ہندوستان میں جو رقبے اور ذرائع کے لحاظ سے پاکستان سے کئی گنا بڑا تھا، ہندو یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ پاکستان جو ذرائع، انتظامی نظام اور تجربے، سیاسی اداروں اور قیادت کے اعتبار سے بہت کمزور ہے، اس نقاہت کی تاب نہ لا کر ٹوٹا ہی چاہتا ہے اور یہ جذباتی مسلمان اپنی جلدبازی پر پچھتاتے ہوئے اکھنڈ بھارت میں دوبارہ شامل ہونے کے لئے گھٹنے ٹیک دیں گے۔ آر۔ ایس۔ ایس گھڑیاں گن رہی تھی۔ اور سچ بھی ہے کہ تقسیم کے پیدا کردہ مسائل کے بوجھ نے پاکستان کو ادھ موا کر دیا تھا۔ اس وقت تک ایسے ہنگامی حالات میں بین الاقوامی امداد کا نہ تو اتنا رواج تھا اور نہ ہی کوئی ہمسایہ ملک ایسی مدد پر مائل تھا۔ لیکن ان تمام تر مجبوریوں کے باوجود اس نوزائیدہ قوم نے ایسی حوصلہ مندی، جرأت اور غیرت کا مظاہرہ کیا کہ اس کی مثال نہیں۔ چنانچہ پاکستان کی ریاست قائم ہوئی اور کاروبار ریاست شروع ہو گیا۔

اگر پاکستان کا قیام ایک معجزہ تھا تو ان حالات میں اس کا قائم رہ جانا ایک دوسرے معجزے سے کم نہیں تھا۔ اس نے پشاور سے لے کر چٹاگانگ تک لوگوں کو متحد رکھا کہ وہ اپنے آپ کو پاکستانی کہنے پر فخر محسوس

کرتے تھے اور بھول گئے تھے کہ وہ پٹھان ' پنجابی ' سندھی ' بلوچی یا بنگالی ہیں۔ اوائل کا یہ جذبہ قومیت کا بہترین مظہر تھا۔ لیکن افسوس کہ حالات کچھ ایسے بگڑے کہ متلون مزاجی 'لالچ اور اقتدار کی ہوس نے طالع آزمائی کے دور کا آغاز کر دیا' جس کا سایہ آج تک ہمارے سروں سے نہیں ٹلا۔

بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ ستمبر ۱۹۴۸ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس وقت پاکستان کو عالم وجود میں آئے ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا۔

ان کے بااعتماد دست راست لیاقت علی خان کو ۱۹۵۰ء میں قتل کر دیا گیا۔ ان کی سیاسی جماعت باوقار مسلم لیگ جو پاکستان کی معمار تھی' اندرونی خلفشار کا شکار ہو کر دھڑوں میں بٹ گئی اور ملک میں ایک عمیق سیاسی خلاء پیدا ہو گیا۔ نوکر شاہی نے اس خلاء کا فائدہ اٹھایا اور عنان حکومت سنبھال لیں۔ اس طرح غلام محمد جیسا شخص جو وزارت خزانہ کا وزیر تھا پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہو گیا۔ جہاں تک ذاتی اقتدار و اختیار کا تعلق ہے وہ انتہائی چال باز اور بد دیانت انسان تھا۔ اس نے آئین ساز اسمبلی کو معزول کیا اور اپنے حق میں عدالتی فیصلہ بھی لے لیا۔ خواجہ ناظم الدین جو تحریک آزادی میں قائداعظمؒ کے قریب ترین ساتھیوں میں سے تھے اس وقت پاکستان کے وزیراعظم تھے۔ غلام محمد نے ان کو اس عہدے سے برطرف کرنے کیلئے نہایت ادنیٰ ہتھکنڈے استعمال کئے اور ان کی جگہ محمد علی بوگرہ پھر ایک اور بیوروکریٹ چودھری محمد علی کو وزیراعظم بنایا۔ گو آخر میں غلام محمد تقریباً اپاہج ہو چکا تھا' زبان ایک لفظ صحیح ادا نہیں کر سکتی تھی' لیکن وہ اقتدار کی مسند چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ آخر کار ایک اور بیوروکریٹ سکندر مرزا جو کہیں زیادہ چال باز تھا' غلام محمد کو ہٹا کر خود گورنر جنرل کا عہدہ سنبھال بیٹھا۔

چودھری محمد علی کی سربراہی میں دوسری آئین ساز اسمبلی نے آئین تشکیل دیا جو ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ کیا گیا اور ۱۹۵۶ء کا آئین کہلایا۔ اس آئین کی رو سے جو نوآبادیاتی درجہ DOMINION STATUS ۱۹۴۷ء کے انڈی پینڈینس ایکٹ INDEPENDANCE ACT نے پاکستان کو دیا تھا وہ ختم کر دیا گیا اور پاکستان کو ایک مکمل طور پر آزاد جمہوریہ قرار دیا گیا۔ گورنر جنرل جو تاج برطانیہ کا نمائندہ تھا اب آزاد ملک کا صدر کہلانے لگا۔ اس طرح سکندر مرزا صدر پاکستان بن تو گیا لیکن دل ہی دل میں وہ خوف میں مبتلا تھا کہ ۱۹۵۹ء میں جب ملک میں عام انتخابات ہوئے تو اسے یہ کرسی صدارت چھوڑنی پڑے گی۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے ہر طرف ایک خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ سیاسی جماعتیں الیکشن کی تیاری میں مصروف تھیں۔ مسلم لیگ پھر آن بان کے ساتھ میدان میں آ گئی تھی۔ اس جماعت کا ایک جلوس جس کی قیادت خان عبدالقیوم خان کر رہے تھے میلوں لمبا نکلا اور گھنٹوں چلتا رہا۔ عوام کا یہ جوش و خروش دیکھ کر سکندر مرزا بوکھلا گیا۔

راولپنڈی سازش کیس

تقسیم ہند کے وقت پاکستانی فوج کو مہاجرین کی نقل و حرکت کا کام سونپا گیا جو ہمارے جوانوں نے تندہی اور جانبازی سے کیا اور عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ عین اسی وقت ملک کے بڑے دریاؤں میں طوفان آ گیا۔ سڑکیں ٹوٹ گئیں اور دریاؤں کے کنارے کے گاؤں بہہ گئے۔ سیلاب کی وجہ سے سلسلہ آمدورفت منقطع ہو گیا۔ اس عذاب الٰہی میں بھی فوج کو متاثرہ علاقوں میں ریلیف کے کام پر تعینات کیا گیا جو اس نے بطریق احسن کیا۔ اس طرح عوام کے دل میں افواج پاکستان کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہوئے۔ لیکن یہ جذبات کچھ دیرپا ثابت نہ ہو سکے کیونکہ تین برس کے قلیل عرصے میں ہی چند فوجی افسروں نے میجر جنرل محمد اکبر خان کی سربراہی میں حکومت وقت کا تختہ الٹنے کی سازش کی۔ اس سازش کی محرک تو ہوس اقتدار ہی تھی لیکن طریق کار سراسر اشتراکی رہنماؤں کی ذہنی کاوش تھا۔ یہ اشتراکی ٹولہ جس میں سجاد ظہیر، ظفراللہ پوشنی، فیض احمد فیض، سی۔ آر۔ اسلم وغیرہ پیش پیش تھے، دراصل پاکستان میں بائیں بازو کی تحریک کی صف اول تھا۔ اگر جنرل اکبر کا خیال تھا کہ وہ انہیں استعمال کر کے طاقت حاصل کر سکتا ہے تو یہ حضرات اس فکر میں تھے کہ جنرل اکبر کو استعمال کریں، وقت آنے پر اسے الگ کر دیں اور بائیں بازو کی حاکمیت قائم کر دیں۔ بہرحال دونوں کے عزائم تشنہ تکمیل رہ گئے کیونکہ سازش بروقت پکڑی گئی، ان صاحبان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں مختلف سزائیں دی گئیں۔ یہ مقدمہ راولپنڈی سازش کیس کہلایا۔ اس نے عوام کے دلوں میں فوج کے متعلق شکوک پیدا کر دیئے۔

پہلا مارشل لاء

جنرل محمد ایوب خاں، پاکستان کا پہلا کمانڈر ان چیف پاکستان آرمی سینڈہرسٹ کا گریجوایٹ تھا۔ اس کا سروس ریکارڈ معمولی تھا۔ جب سے لیاقت علی خان کا قتل ہوا ملک میں محلاتی سازشوں کا جال بچھا اور نوکر شاہی اقتدار پر قابض ہو گئی۔ ایوب خان کے ذہن میں بھی یہ خیال پرورش پانے لگا کہ اگر ملک میں اقتدار پر قبضہ کرنا اتنا ہی آسان ہے تو وہ کیوں پیچھے رہے۔ غلام محمد، چودھری محمد علی اور سکندر مرزا کا نہ کوئی حلقہ نیابت تھا اور نہ ہی عوامی نمائندگی کا کوئی شائبہ۔ وہ محض سول حکومت کے ملازم تھے اور اس حکومت میں سوائے اپنے چپڑاسیوں کے کسی اور فرد پر اپنی سیاسی لیڈری کا دعویٰ نہیں رکھ سکتے تھے جبکہ ایوب خان ایک پوری منظم فوج کا سربراہ تھا، فوج بھی وہ جو اپنے کمانڈروں کے حکم پر جاں نثار کرنے میں دریغ نہیں کرتی۔ اس نے اقتدار پر اپنا حق فائق سمجھا۔ راولپنڈی سازش کیس کے ملزمان ناپختہ ذہن کے طالع آزما تھے، جن کی بے صبری، غفلت اور کمزور قیادت نے ان کی سازش کا بھانڈا پھوڑا اور وہ قانون کی گرفت میں

آ گئے۔ کسی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے محتاط منصوبہ بندی، صحیح وقت کا انتخاب اور ایک وفادار ٹولے کی مکمل حمایت ضروری ہیں۔ ایوب خان نے اپنا منصوبہ بڑی احتیاط سے بنایا۔ سیاسی شطرنج کی بساط کا بغور مطالعہ کیا اور اپنا ٹائم ٹیبل ترتیب دیا۔ اس نے فوج کو خوب مضبوط کیا اور اپنے خاص اعتماد کے افسران کو مناسب پوزیشنوں پر فائز کیا۔ اندرون ملک ان سیاست دانوں اور بیوروکریٹ صاحبان کی فہرست مرتب کی جو اس کے پروگرام پر معترض ہو سکتے تھے اور ان کی بھی جو آسانی سے اپنے ساتھ ملائے جا سکتے تھے۔ اس تمام عرصہ میں وہ سیاسی حکومتوں سے نہایت خوشگوار تعلقات رکھتا رہا تاکہ اس کی مدت ملازمت میں توسیع ہوتی رہے۔ بیرون ملک بھی مناسب مقامات پر دوست بنائے۔ بیرون ملک اپنے لئے حمایت پیدا کرنے کے لئے اس نے پاکستان کے جغرافیائی اور فوجی نکتہ نگاہ سے اہم محل وقوع پر زور دیا، اپنے ملکی مفاد سے قطع نظر دوسرے ممالک کو ایسی ایسی سہولتیں دینے پر رضامندی ظاہر کی جو کوئی آزاد ملک کسی دوسرے ملک کو نہیں دیا کرتا۔

ہندوستان کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت پاک۔ ہند سرحد پر دونوں طرف نیم فوجی دستے PARA MILITARY FORCES گشت کرتی تھیں۔ مقصد یہ تھا کہ فوجیں سرحد سے دور رہیں اور اچانک ٹکراؤ کے امکانات کم ہوں۔ پاکستان میں صوبہ پنجاب میں اس نیم فوجی دستے کو بارڈر پولیس سندھ میں ستلج رینجرز اور مشرقی پاکستان میں ایسٹ پاکستان رائفلز کہا جاتا تھا۔ یہ تمام دستے خاص طور پر غیر فوجی اور سول محکمے کے حصے تھے۔ ان میں پولیس افسر تعینات ہوتے تھے اور یہ صوبے کے سیکرٹری داخلہ کے تحت کام کرتے تھے، لہٰذا ہنگامی حالات میں صوبائی حکومتیں ان سے کام لے سکتی تھیں اور لیتی تھیں۔ نفری کے لحاظ سے تو یہ دستے پولیس کی مانند تھے لیکن ان کے پاس خود کار اسلحہ تھا اور دیگر ساز و سامان بھی پولیس سے زیادہ اور بہتر تھا۔ ایوب خان کے منصوبے میں یہ نیم فوجی دستے جو صوبائی حکومتوں کے تحت تھے خطرہ ثابت ہو سکتے تھے۔ لہٰذا اس نے ان کو براہ راست فوج کے زیر کمان لینے کیلئے تحریک کی۔ صوبائی حکومتوں نے بہت احتجاج کیا لیکن کمزور وفاقی حکومت ایوب خان کی تحریک کو انکار نہ کر سکی اور پنجاب کی بارڈر پولیس، سندھ کے رینجرز اور ایسٹ پاکستان رائفلز سب فوج کے حوالے کر دیئے گئے۔ ایوب خان نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام پولیس افسران کو نکال کر ان کی جگہ چیدہ چیدہ فوجی افسر تعینات کئے۔ سپاہ بھی بیشتر ریٹائرڈ فوجیوں میں سے رکھی اور اس طرح اس سمت سے مخالفت کے امکان ختم ہو گئے۔ یہ کام اوائل ۱۹۵۸ء میں ہوا اور اس کے بعد ایوب خان کا منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچنے کیلئے تیار ہو گیا۔

برطانوی دور میں سکندر مرزا نے حکومت کے مفاد کی خاطر ہر طرح کے غیر اخلاقی حربے استعمال کرنے میں کمال حاصل کیا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے جن دنوں نو آبادیاتی حکمرانوں کے خلاف تحریک چل رہی تھی، سکندر مرزا کو صوبہ سرحد میں ایک احتجاجی گروہ سے نپٹنا پڑا۔ پولیس بلا کر جلسے جلوسوں پر تشدد

کرنے کی بجائے اس نے انتظامیہ کی طرف سے تمام احتجاجیوں کی ضیافت کر دی۔ مہمان نوازی اور مہمانی کے عادی سیدھے سادے پٹھان لوگوں نے ضیافت قبول کی، کھانا کھایا اور سب کے سب پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئے اور سخت بیمار پڑ گئے۔ سکندر مرزا نے کھانے میں جمال گوٹہ ملایا ہوا تھا۔ اس طرح یہ احتجاجی جلسہ نہ ہو سکا اور نہ ہی احتجاجیوں کا کوئی کیمپ لگ سکا۔ سکندر مرزا کو انگریز حکام سے اس کارنامے کی مناسب داد ملی کہ اس نے اپنے ہم وطنوں سے دغابازی، مکاری اور غدّاری کر کے سرکار انگلیشیہ کی خدمت گزاری اور وفاداری کی کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ ۱۹۵۸ء میں جب سیاسی سرگرمیاں زوروں پر تھیں تو سکندر مرزا نے اپنا ترپ کا پتہ کھیلا۔ سیاست دانوں کے جائز عزائم کو ناکام بنانے کے لئے اس نے ایوب کو اپنی سازش میں ساتھ ملایا تاکہ مارشل لاء کا اعلان کر دیا جائے۔ ایوب خان شامل ہو گیا کیونکہ خود اس کے اپنے منصوبے کے لئے بھی یہی مناسب وقت تھا۔ لہٰذا اس وقت جبکہ ملک میں ہر طرح سے امن و امان تھا، عوام الیکشن کی تیاریوں میں مصروف تھے اور خوش تھے کہ اب وہ اپنے نمائندوں کے ذریعے ملک کے انتظام میں بھرپور حصہ لے سکیں گے، ۸ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو ملک میں مارشل لاء لگ گیا۔ صرف انیس دن بعد ایوب خان نے سکندر مرزا کو معزول کر دیا اور کمال شفقت کا اظہار کرتے ہوئے اسے ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔

سکندر مرزا کا ذکر چھوڑنے سے پہلے ایک نیم مزاحیہ اور نیم المیہ واقعہ بھی بیان ہو جائے کہ اس میں عبرت کا پہلو بھی ہے۔ میر جعفر جس نے بنگال میں تحریک آزادی کے وقت سراج الدّولہ سے غدّاری کی تھی، سکندر مرزا کے اجداد میں سے تھا، یہ وہ میر جعفر تھا جسے اقبالؒ نے ننگ دنیا، ننگ دیں، ننگ وطن کہا ہے اور ہر تاریخ کی کتاب میں اس کا نام غدّار کی حیثیت سے لکھا جاتا ہے۔ ساری زندگی اور خصوصاً اپنی ملازمت کے دوران سکندر مرزا کی کوشش رہی کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ وہ میر جعفر کی اولاد میں سے ہے۔ جب ایوب خان نے سکندر مرزا کو ذلیل کر کے نکال دیا تو وہ اپنے آقاؤں کے دیس یعنی انگلینڈ چلا گیا اور لندن پکاڈلی ہوٹل PICCADILLY HOTEL میں قیام پذیر ہوا۔ ایک ماہ بعد اسے ایک فلیٹ مل گیا اور وہ اس میں منتقل ہو گیا۔ جس وقت وہ ہوٹل چھوڑ رہا تھا تو حکومت برطانیہ کا ایک افسر بکار خاص وہاں آیا اور سکندر مرزا کا ہوٹل کا بل ادا کر دیا۔ جب سکندر مرزا نے احتجاج کیا تو اس افسر نے کہا کہ ملکہ برطانیہ مرزا اور اس کے اجداد کی خدمت کے صلے میں حق میزبانی ادا کر رہی ہیں۔ جھینپ کر مرزا نے یہ ادنیٰ سی خیرات قبول کر لی اور وہاں سے چلا گیا۔ برطانیہ نے اپنا دیرینہ قرض چکا دیا اور سمجھا کہ اب اس پر سکندر مرزا اور میر جعفر کی خدمات کے صلے کا اور کوئی بار نہیں رہا لہٰذا اس واقعہ کے بعد انہوں نے اسے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ مسٹر جے۔ حصواری جو ایک ممتاز انشورنس کمپنی کے جنرل منیجر ہیں۔ اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ غدّاری کا یہ حقیر صلہ دیکھ کر انسان کانپ جاتا ہے۔ دوستوں سے بیگانہ اور اپنوں کا فراموش کیا ہوا

سکندر مرزا لندن میں ایک ہندوستانی ہوٹل ویراسوامی کی ملازمت کرتا ہوا بالآخر اللہ کو پیارا ہوا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ بوقت مرگ اس کے پاس کوئی تھا بھی یا نہیں یا کسی نے اس کی میت پر چار آنسو بھی بہائے یا حکومت برطانیہ نے اسے سرکاری خرچ پر ہی دفن کر دیا۔

ادھر' درون خانہ مارشل لاء کے ابتدائی دور میں خوف وہراس پھیلانے کے مرحلے جاری تھے۔ عوام کو مارشل لاء لگانے کا کوئی تسلی بخش جواز نہیں دیا گیا کیونکہ ملک میں کسی قسم کے ہنگامے' بدامنی یا قانون شکنی کی کوئی واردات نہیں تھی اس لئے جواز ہوتا بھی کیا۔ ملک کی ہر محرومی کے لئے سیاست دانوں اور سیاسی عمل کو موردالزام ٹھہرانا نہ تو کوئی انصاف ہے اور نہ ہی مارشل لاء نافذ کرنے کا جواز۔ لہٰذا طاقت اور تشدّد کا استعمال اور خوف دونوں حربے بروئے کار لائے گئے۔ صبح سے شام تک کا کرفیو لگا دیا گیا' ہر شہر کے بازاروں میں فوج کی چوکیاں بیٹھ گئیں اور گشت ہونے لگے۔ بین الاقوامی پروازوں اور سفر کو روکنے کے لئے ایئرپورٹ اور بندرگاہیں بند کر دی گئیں۔ ذرائع ابلاغ پر کڑی پابندی لگا دی گئی۔ فوج نہ صرف پیدل گشت کرتی تھی بلکہ ٹینکوں اور بکتربند گاڑیوں پر بھی دن رات طاقت کا مظاہرہ کیا جاتا تھا تاکہ کوئی شہری کسی قسم کا واویلا کرنے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔ ظاہر تھا کہ مارشل لاء حکام نے بہت پہلے سے ہر قسم کی تیاری کر رکھی تھی کیونکہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفتر سے آرڈر اور ریگولیشن برسات کی سرعت سے برس رہے تھے۔ ان مارشل لاء آرڈرز اور ریگولیشنوں کو ملک کے تمام قوانین پر فوقیت حاصل تھی اور عدالتوں کو اختیار نہیں تھا کہ ان سے متعلقہ کوئی سماعت یا کارروائی کریں۔ معمولی جرائم کے لئے ہولناک سزائیں مقرر تھیں۔ مارشل لاء اور افواج پاکستان کی شان میں گستاخی نہایت سنگین جرم تھا۔ مارشل لاء کی پالیسی اور ضروریات کے مطابق عدالتیں قائم کر دی گئیں جہاں خاص قسم کا انصاف میسر آتا تھا۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے تمام دفاتر اور محکمہ جات فوجی افسروں کے ماتحت کر دیئے گئے۔ اضلاع میں ڈپٹی کمشنروں کے دفاتر میں بھی فوجی افسر متعین ہوئے تاکہ ضلع کی انتظامیہ پر نظر رکھ سکیں۔ خصوصاً امن عامہ کے اقدام پر۔ انٹرسروسز انٹیلی جنس کا دائرہ کار ہمیشہ فوجی معاملات تک محدود ہوتا ہے۔ پاکستان میں اس کو وسیع تر کر کے تمام سیاسی امور بھی اس میں شامل کر دیئے گئے۔ سول انٹیلی جنس میں بہت سے فوجی افسران تعینات ہو گئے۔

وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں سے ایک بڑی تعداد میں سول افسران کو بغیر کسی الزام' چارج شیٹ یا صفائی کا موقع دیئے ریٹائر یا ڈس مس کر دیا گیا۔ چونکہ سول نوکر شاہی ایک عرصے سے ملک کی انتظامیہ اور سیاست پر چھائی ہوئی تھی اس کا زور توڑنے کے لئے' یہ دکھانے کے لئے آئندہ حکم کس کا چلے گا اور اپنے نظام کار میں شامل ہونے والے سول بیوروکریٹ حضرات کو مکمل طور پر مغلوب کرنے کے لئے یہ نسخہ بہت کارآمد رہا۔ اس چھانٹی کے بعد نوکر شاہی بڑی مؤدب اور "وفادار" بن گئی۔ سیاسی رہنماؤں کی تشہ

وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں اور اس طرح عوام کو اپنے لیڈروں سے الگ کر کے ہر قسم کے سیاسی عمل کو ختم کر دیا گیا۔ پہلے سے تیار شدہ خصوصی قوانین نافذ کئے گئے جن کے تحت سیاست دانوں پر مقدمے چلائے گئے۔ ان مقدمات کا مقصد یہ تھا کہ سیاست دان لمبے عرصے کے لئے سیاست میں حصہ لینے کے اہل نہ رہیں اور بہرصورت اتنے عرصے کے لئے مقدمات کی پیروی میں ملوث رہیں کہ مارشل لاء کے ٹولے کو وقت مل جائے کہ وہ ملک کے انتظام کے ہر گوشے پر مضبوط گرفت حاصل کر لیں۔ تمام سیاسی جماعتیں کالعدم قرار دے دی گئیں' ان کے کردار و گفتار پر قدغن عائد ہو گئی' اجتماعی کارروائی' تقریر اور تحریر پر پابندی لگ گئی۔ پرائیویٹ سیاسی میٹنگ بھی جرم کی تعریف میں شامل ہوئی۔ پانچ یا زیادہ لوگوں کا مل کر چلنا بھی جرم ہو گیا۔

آئین منسوخ کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اسمبلیاں' وفاقی اور صوبائی حکومتیں توڑ دی گئیں' عوام کے بنیادی حقوق سلب کر لئے گئے' عدلیہ کے اختیارات کو بڑی حد تک محدود کر دیا گیا' فوجی عدالتیں قائم ہوئیں اور اس طرح مارشل لاء کے ٹولے نے ملک کی انتظامیہ پر آہنی گرفت حاصل کر لی۔ مارشل لاء کا خوف' نکتہ چینیوں کو ہولناک سزائیں' بغیر فرد جرم یا عدالتی کارروائی کے لمبے عرصوں کے لئے نظر بندی' امن عامہ میں خلل کے بہانے مخالفوں کے لئے قید و بند' شہر اور قصبہ ہر جگہ فوجی طاقت کا مظاہرہ' ہر نوع کا احتجاج ان اقدامات کے طفیل ختم ہو گیا۔ سیاست کی زبان گنگ ہو گئی' عوام سہم کر گھروں میں قلعہ بند ہو گئے۔ اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ نہتے عوام جن کو اپنے راہنماؤں کے مشورے تک سے محروم کر دیا گیا ہو' جو تقریر و تحریر سے عاری کر دیئے گئے ہوں اور جن کا سامنا ایک منظم فوج سے ہو جو بندوق تانے لبلبی پر انگلی رکھے کسی بھی ناپسندیدہ حرکت کی تاڑ میں ہو' ایسے حالات میں وہ عوام کر بھی کیا سکتے تھے۔ لوگ کرفیو کے اوقات کی پابندی کرتے تھے۔ ذرائع ابلاغ پر سنسر کا پہرہ تھا۔ نوکر شاہی جی حضوری میں لگی ہوئی تھی۔ قوم ذہنی طور پر بھی اور عملی طور پر بھی ہتھیار ڈال چکی تھی۔ ملک میں امن تھا۔ لہٰذا مارشل لاء حکام نے اطمینان کا سانس لیا اور آہستہ آہستہ کرفیو اور فوجی گشت کم ہونے لگے۔

وفاقی سطح پر ایک وزارت تشکیل دی گئی۔ اس میں آدھے ممبران افواج پاکستان اور آدھے نوکر شاہی سے یا ایسے سویلین جن کا عوام سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا لئے گئے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے صوبہ جات میں گورنر فوجی لگائے گئے جنھوں نے اپنی وزارتیں خود تشکیل دیں۔ ان وزارتوں میں وزراء اور مشیر شامل تھے۔ فوجی عدالتیں قائم رہیں اور مارشل لاء آرڈر اور ریگولیشن قوم پر دباؤ رکھنے کے لئے باقاعدگی سے جاری ہوتے رہے۔

ایوب نے آئین کے ساتھ کیا سلوک کیا یہ مفصل طور پر پچھلے باب میں لکھا جا چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ گو لیاقت علیخان کے بعد سیاست دانوں پر یہ الزام تو لگ سکتا ہے کہ انہوں نے ملک

کو در پیش مسائل کے حل میں تساہل سے کام لیا لیکن اس آئین کو جو عوام کی امنگوں کا آئینہ دار تھا' منسوخ کر دینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اس آئین میں ہر وہ شق موجود تھی جو ملک کو ایک صحیح سمت دیتی تھی' لوگوں کے پسندیدہ طرز حکومت اور قانون سازی کا انتظام کرتی تھی اور زندگی کے ہر شعبے میں مناسب راستوں کا تعین کرتی تھی۔ البتہ ایک شق اس میں واقعی موجود نہیں تھی اور وہ تھی جنرل ایوب خان کے لئے تازیست اقتدار کی ضمانت۔ جمہوری طرز زندگی میں ہر شخص' بشمول ملازمان افواج' اقتدار کی دوڑ میں حصہ لے سکتا ہے۔ ملازمت سے خواہ سول حکومت کی ہو یا مسلح افواج کی' نکل کر دو سال بعد اپنے لئے ایک حلقہ نیابت ڈھونڈ لیا جائے اور رائے دہندگان کو یقین دلایا جائے کہ آپ یا آپ کی جماعت کے پاس ایک جامع پروگرام ہے جسے آپ اقتدار میں آ کر نافذ کریں گے اور جس سے ملک و قوم کی ترقی اور بول بالا ہو گا۔ پھر اگر رائے دہندگان آپ کے پروگرام کو آپ کے مخالفین کے پروگرام سے بہتر پا کر آپ کو ووٹ دیں اور آپ کو اقتدار نصیب ہو تو آپ یا آپ کی جماعت ایک مقررہ مدّت کے لئے حکومت کی باگ ڈور سنبھالیں گے اور اپنا پروگرام نافذ کریں گے۔ اگر عوام آپ کی کارکردگی سے مطمئن ہوں تو وہ آپ کو دوبارہ ووٹ دیں گے۔ ۱۹۵۶ء کے آئین نے یہی طریقہ کار نافذ کیا تھا جیسا کہ ہر جمہوری آئین کرتا ہے۔ ایوب خان اور اس کے ساتھی جانتے تھے کہ یہ طریق کار ان کے بس کا نہیں۔ سب سے پہلے تو فوج کی کمان کا عہدہ چھوڑا جائے۔ پھر ملکی ترقی اور عوامی بہبود کا ایسا پروگرام بنایا جائے جو عوام کو پسند آئے۔ اور اگر انفرادی طور پر یہ راستہ مناسب نہ معلوم ہو تو کسی پارٹی میں سب سے نیچے کی سیڑھی سے شروع کر کے قیادت تک پہنچا جائے۔ یہ سب کچھ کرنے کے لئے وقت اور تگ و دو درکار ہے اور پھر کامیابی کی کوئی گارنٹی نہیں۔ لہٰذا ان اقتدار کے بھوکے جرنیلوں نے اپنے حواریوں کو ساتھ ملایا۔ سپاہ جس کی ساری تربیت اور ٹریننگ ہی حکم برداری کی ہے اور جو اپنے افسروں کے کہنے پر جان جوکھوں میں ڈالنے کی عادی بنا دی جاتی ہے' ایسی سپاہ کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کیا۔

برطانیہ کی نو آبادیاتی حکومت اپنی فوج میں ملک کے پسماندہ' غریب' بارانی علاقوں سے نفری بھرتی کرتی تھی۔ یہ لوگ مطلقاً جاہل ہوتے تھے انہیں چھاؤنیوں میں باقی شہریوں سے الگ رکھا جاتا تھا اور شہروں میں جانے کی اجازت تک نہیں ہوتی تھی کہ مبادا ان پر کوئی سیاسی اثر پڑ جائے۔ دن رات ان کو سخت سے سخت ٹریننگ دی جاتی تھی اور حکم ماننے کا عادی بنایا جاتا تھا۔ حکم کیسا ہی نامعقول کیوں نہ ہو یہ بلاچون وچرا مانتے تھے کہ یقیناً حکم دینے والے افسران جو عقل کل تھے' بہتر جانتے تھے۔ ان کے ہر حکم میں کوئی مصلحت ہوتی تھی جسے نہ یہ سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ ہی اس کی ضرورت سمجھتے تھے۔ پاکستانی فوج کی تربیت بھی انہی خطوط پر کی جاتی ہے۔ ہمارا سپاہی بھی ہر فیصلہ اپنے کمانڈر پر چھوڑنے کا عادی ہے۔ فیصلہ کرنا اس کا کام ہے۔ حکم بجا لانا سپاہی کا۔ افسر جو بھی حکم دے گا اس میں وقتی مصلحت کے علاوہ

ملک ' قوم اور خود حکم بجالانے والے سپاہی کی بھلائی کا عنصر یقینی طور پر ہو گا۔ غور سے دیکھا جائے تو یہی اصول ساری قوم پر لاگو ہے۔ تعلیم سے بے بہرہ لوگ حکمرانوں سے سوال نہیں کرتے ' ان کا احتساب نہیں کرتے ' ہر حکم پر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

بہت عرصے کی ایک بات یاد آئی جب میں سپرنٹنڈنٹ پولیس ہوتا تھا۔ موسم سرما میں دیہاتی دورہ کرنا ہوتا تھا۔ گاؤں گاؤں جا کر لوگوں سے ملنا' جرائم کی پڑتال کرنا' عادی مجرموں کی نگہداشت ' تھانوں کی انسپکشن ' علاقے کے حالات وغیرہ کا مکمل جائزہ لینا' سب اس دورے میں شامل ہوتا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں ضلع ملتان کے ایک دور دراز علاقے میں اسی قسم کا دورہ کر رہا تھا۔ جب گاؤں کے لوگ اکٹھے ہوتے تھے تو میں علاوہ جرائم کے کوائف لینے کے لئے گاؤں کا سکول بھی دیکھ لیا کرتا تھا۔ ایک گاؤں میں سکول نہیں تھا۔ نہ ہی آس پاس دور دور تک کوئی سکول تھا۔ میں نے وجہ پوچھی تو لوگ چپ رہے۔ میں نے کرید کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے گاؤں کے مالک زمیندار کی تحریک پر ایک پرائمری سکول کھول گیا تھا اور زمیندار کا اپنا بیٹا جو جسمانی طور پر قدرے کمزور تھا' وہ بھی اسی سکول میں پڑھتا تھا. دو ایک سال میں جب وہ کچھ توانا ہوا تو گاؤں کا سکول چھوڑ کر لاہور کے چیفس کالج چلا گیا اور زمیندار صاحب نے سکول بند کروا دیا۔ یہ قصہ سن کر مجھے بڑا طیش آیا اور بغیر سوچے سمجھے میں نے گاؤں کے لوگوں سے کہہ دیا جب تک آپ کے گاؤں کا سکول دوبارہ نہیں کھل جاتا آپ لوگ زمیندار کو بٹائی نہ دیں۔ مزید حماقت میں نے یہ کی اپنی دورے کی رپورٹ میں بھی یہ سب کچھ لکھ دیا اور متعلقہ محکمہ جات کو اس کی نقلیں بھی بھیج دیں۔ نتیجہ ظاہر ہے وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی مجھے مختلف محکموں کی طرف سے اعتراضات اور اپنے محکمے کی طرف سے تنبیہ موصول ہوئی۔ لیکن سنہری پہلو اس کا یہ تھا کہ گاؤں میں سکول کھل گیا۔

پاکستان کی مختصر تاریخ میں ' جس میں مارشل لاء کا عرصہ بیشتر عرصے میں محیط ہے ' تعلیم کے فروغ کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ اطلاعات کے محکمے پر کروڑوں کا خرچ اس لئے کیا جاتا ہے کہ حکومت کا بول بالا ہوتا رہے۔ اس کے مقابلے میں تعلیم کا بجٹ کہیں کم رہتا رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ شرح خواندگی جو تقسیم ہند کے وقت تھی یعنی ۱۹ فیصد' ترقی کرتے کرتے اسی شرح پر قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلیم کی پیداوار پڑھے لکھے عوام حکومت کے لئے درد سر اور ان پڑھ عوام حکومت کے لئے آسانی' خصوصاً غیر نمائندہ حکومتوں کے لئے۔ اس کے مقابلے میں محکمہ اطلاعات دن رات حکمرانوں کی تعریف کے پل باندھتا ہے ' ان کی ہر غلط حکمت عملی اور ہر غلط اقدام کو صحیح اور ملکی مفاد کا حامل بتاتا ہے ' جاہل عوام ایسے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر حکمرانوں کو اپنا بہی خواہ سمجھتے ہیں۔ تعلیم یافتہ عوام اس کے برعکس نکتہ چینی کرتے ہیں ' سوال کرتے ہیں ' احتساب کا مطالبہ کرتے ہیں۔

یہ بات تو روزِ اول سے ہی عیاں تھی کہ ایوب خان کا اقتدار کی کرسی چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ چنانچہ اس نے صنعت کاروں اور بڑے زمینداروں کی اس لئے پشت پناہی کی کہ وہ اس کے سیاسی معاون بنیں اور ہر سیاسی مہم میں اس کی بھرپور مدد کریں، جلسے جلوس کرائیں، ووٹ ڈلوائیں اور ہر مہم کا خرچ اٹھائیں۔ حکومت پر گرفت مضبوط کرنے کے بعد اس نے ملک کو ملک کے لئے نہیں بلکہ اپنے، یعنی ایوب کے لئے ایک بنا بنایا آئین دیا جیسا کہ ہم پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں، اس آئین میں، بقول مرحوم خورشید احمد وزیر قانون کے، صدر فیصل آباد کے گھنٹہ گھر کی طرح چہار اطراف سے بلند و بالا دکھائی دیتا ہے۔ بہر طور ۳ سال اور ۸ ماہ کے عرصے کے بعد ملک سے مارشل لاء ہٹا لیا گیا اور ایک نام نہاد اسمبلی بھی قائم کر دی گئی۔ اور دو سال بعد وہی دھاندلی والا الیکشن کرایا گیا۔ جنرل ایوب خان جو از خود فیلڈ مارشل ایوب خان بن چکا تھا ایک مغل بادشاہ کی طرح حکمرانی کرنے لگا۔ افسوس کہ تخت طاؤس کم بخت نادر شاہ لے گیا تھا ورنہ یقیناً استعمال ہوتا۔

آمر کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، فی زمانہ انتظامیہ کے ہر پہلو پر حاوی نہیں ہو سکتا اور اسے صاحب علم ماہرین اور معاونین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایوب خان کو بھی یہ مشکل پیش آئی اور اسے بھی ماہرین اور معاونین کو ڈھونڈنا اور مختلف عہدوں پر تعینات کرنا پڑا۔ لیکن وہ ہر لمحہ چوکنا رہتا تھا کہ کہیں میرے ساتھ کوئی دوسرا اقتدار کا دعویدار نہ بن جائے۔ اس ضمن میں لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان کی مثال صادق آتی ہے۔ اعظم خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اتفاق سے انہیں دنوں وہاں ایک بے پناہ سیلاب آ گیا جس سے آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ متاثر ہوا۔ جنرل اعظم نے خود موقعہ پر جا کر گھنٹوں نہیں کئی کئی دنوں کیمپ کیا، اپنے ہاتھ سے لوگوں کو سہارے دیئے، ریلیف کا سامان بانٹا اور مرمت وغیرہ کا کام شروع کروایا۔ وہ غریب عوام جو طوفانوں کی زد میں آ جاتے ہیں توقع بھی نہیں کرتے کہ کوئی اتنا بڑا افسر یوں ان کی مدد اور دل جوئی کے لئے اپنے محل سے نکل کر ان کی جھونپڑیوں میں آئے گا، ان کے پاس بیٹھے گا، ان کی تکالیف سنے گا اور ہمدردی کرے گا۔ جنرل اعظم کا مشرقی پاکستان میں مقبول ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ یہ دیکھتے ہی ایوب خان کا ماتھا ٹھنکا اور جنرل اعظم کو فوراً واپس بلا لیا گیا۔ جیسا کہ پچھلے باب میں کہا گیا ایوب خان کا حکومت کرنے کا نسخہ یہی تھا کہ عوام اور ان کے صحیح نمائندوں کو اقتدار سے دور رکھا جائے اور اپنے گرد نوکر شاہی کا ایک حصار بنا لیا جائے۔ اسی لئے بالواسطہ انتخابات کا طریقہ رائج کیا گیا، آئین میں انتظامیہ کو مضبوط اور مقننہ اور عدلیہ کو کمزور کیا گیا۔ تمام تر طاقت کا سرچشمہ صدر کو بنایا گیا۔ خواہش ایوب خان کی یہ تھی کہ قوم سوچنے کے فضول دھندے میں نہ پڑے، سوچ اور تدبر حاکمانِ وقت کا مشغلہ یا دردِ سر رہے۔ قوم ان کے ہر فیصلے پر آمین کہے اور ان کے احکام بجا لانے میں جُت جائے۔ چیدہ چیدہ سول ملازمین کو حکومت کے بست و کشاد میں دخل حاصل تھا۔ اس طرح ریاست مکمل طور پر ایک انتظامیہ کی



شیخ مجیب الرحمان۔اندرا گاندھی

حکومت بن کر رہ گئی تھی۔ اس فوج اور سول افسران کے امتزاج نے بڑے شاہانہ انداز میں ایک مکمل آمرانہ نظام قائم کر دیا جس میں کسی کو حکومت کے فیصلوں پر نکتہ چینی کی جرأت نہیں ہوتی تھی، کوئی فیصلہ زیر بحث نہیں آ سکتا تھا۔ ان کا فیصلہ اٹل اور حرف آخر ہوتا تھا اور باقی حکومت کی مشینری کا کام تھا اس پر عمل پیرا ہونا۔ عوام میں سے صرف بڑے بڑے زمیندار ہی ایوب کی طرف بڑھے، ایوب نے بھی ان کی پیش قدمی کی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ان کا سیاسی اثر و رسوخ استعمال کیا جائے۔

حکومت کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی میں حکومت کے دارالخلافہ کو تبدیل کرنا بھی پہلے ہی سے شامل تھا۔ چنانچہ دارالخلافہ کراچی سے راولپنڈی لے جانے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ ایک قصبہ جو پہلے سے منتخب کیا جا چکا تھا، اٹھا دیا گیا اور اس کی جگہ ایک نیا شہر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ اس طرح اسلام آباد کا دارالخلافہ معرض وجود میں آیا۔ اس نقل مکانی میں مصلحت یہ تھی کہ ایوب بیک وقت دارالخلافہ میں بھی اور جی۔ ایچ۔ کیو میں بھی موجود رہے تاکہ فوج، جو اس کی طاقت کا اصل سرچشمہ تھی ہر وقت زیر نگاہ رہے۔ سول اور ملٹری کے انٹیلی جنس کے ادارے بھی فوراً راولپنڈی منتقل کر دیئے گئے۔ ان انتظامات کے طفیل ایوب فوج کی سربراہی کے ساتھ ساتھ نام نہاد قومی اسمبلی کو قریب سے دیکھ بھی سکتا تھا اور ان کی فرداً یا اجتماعی سرگرمیوں کی مکمل اطلاعات بھی اسے پہنچائی جاتی تھیں۔ گو دارالخلافہ کا اسلام آباد منتقل ہونا ایوب اور اس کے رفقاء کے لئے مفید تھا، لیکن شومئی قسمت سے مشرقی اور مغربی پاکستان کی اخوت میں پہلی دراڑ اسی سے پڑی۔ کراچی کو دارالخلافہ خود قائداعظمؒ نے بنایا تھا اور ملک کے دونوں حصوں نے اسے خوشی سے قبول کیا تھا۔ علاوہ بریں سمندری راستہ سے آتے ہوئے مشرقی پاکستانی اسی بندرگاہ پر اترتے تھے۔ اس کی آب و ہوا بھی مشرقی پاکستان سے ملتی جلتی تھی۔ بنگالیوں کو اس وجہ سے اس شہر سے کچھ جذباتی لگاؤ ہو گیا تھا۔ اسلام آباد اندرون ملک بہت دور تھا، زیادہ سرد تھا اور آبادی کے لحاظ سے خالص ایک ہی صوبے کا شہر تھا۔ کراچی کی آبادی اس کے مقابلے میں پورے پاکستان کی نمائندگی کرتی تھی۔ بنگالیوں کی نمائندگی فوج میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ راولپنڈی، جی۔ ایچ۔ کیو وغیرہ ان کے لئے غیر مناسب جگہیں تھیں۔ لہٰذا اس نقل مکانی سے بداعتمادی پیدا ہونی شروع ہو گئی۔

۱۹۶۲ء میں جب ہندوستان اور چین کے درمیان سرحد پر جنگ ہوئی تو وزیراعظم جواہر لعل نہرو کو فکر لاحق ہوئی کہ پاکستان حالات کے فائدے اٹھا کر مقبوضہ کشمیر پر حملہ نہ کر دے۔ چنانچہ نہرو کی جانب سے امریکہ نے پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ ایسی کوئی حرکت نہ کی جائے اور یہ بھی یقین دہانی کرائی کہ جیسے ہی ہندوستان چینی محاذ سے فارغ ہو، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مذاکرات ہوں گے اور ایک منصفانہ تصفیۂ کشمیر کے متعلق ہو جائے گا۔ ایوب فوراً تیار ہو گیا اور نہرو کو اطمینان دلایا کہ وہ کشمیر پر ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ جب ہندوستان اور چین کے درمیان امن ہو گیا تو پنڈت نہرو نے اپنے شاطر وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ کو

واضح ہدایات کے ساتھ پاکستان سے مذاکرات کے لئے بھیجا۔ یہ مذاکرات دہلی اور مری میں ہوتے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں ' بے مقصد بحث اور بے معنی دلائل کے ساتھ سورن سنگھ نے بڑی خوبصورتی سے ان مذاکرات کو ڈیڈ لاک کر دیا اور بات ختم ہوگئی۔ یہی چال پنڈت نہرو کی شروع دن سے تھی اور اس طرح ایک تجربہ کار سیاست دان نے ایک سیدھے سادے 'سیاست کے رموز سے نا آشنا جرنیل کو ایک اور مات دے دی۔

کشمیر کے لئے ۱۹۶۵ء کی ہند۔ پاک جنگ کے نازک مرحلے پر ایوب کی کمزور لیڈر شپ کی قلعی کھل گئی۔ وہ اور اس کے جرنیل اپنے ہی ملک کے عوام پر استبداد سے حکومت تو کر سکتے تھے اور کر رہے تھے لیکن دشمن کا سامنا کرتے ہوئے ان سے کچھ بن نہ پڑی۔ ایوب نے جنگ بندی کے جو جتن کئے ان کو دیکھ کر عوام اس سے متنفر ہوگئے۔ غلط اور مبالغہ آراء خبروں سے عوام کو پہلے تو تاثر دیا گیا کہ پاکستان جیت رہا ہے اور عنقریب ہی ایک بہت بڑی فتح ہونے والی ہے۔ پھر یکایک جنگ بندی کی خبر آگئی۔ حزب مخالف نے ایوب پر بہت کڑی تنقید کی۔ کہا گیا کہ اپنی جان بچانے کے لئے ایوب نے ملک کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ لوگ غم و غصے سے سڑکوں پر نکل آئے اور احتجاج کے نعرے بلند ہوئے۔ لیکن ایوب امن کے سمجھوتے پر راضی ہو گیا اور سوویت یونین کی دعوت پر وزیر اعظم ہندوستان کے ساتھ اس سمجھوتے پر دستخط کرنے کے لئے تاشقند روانہ ہو گیا۔ مسلسل کئی دنوں کے مذاکرات کے بعد بالآخر سمجھوتہ ہو گیا' جس کے مطابق دونوں ملکوں کی فوجیں اپنی سرحدوں کو واپس چلی گئیں۔ کشمیر کے مسئلے کا کوئی ذکر اس سمجھوتے میں نہ آسکا۔ ملک میں عوام تاشقند کے سمجھوتے پر بہت مشتعل ہوئے۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو جو اس وقت وزیر خارجہ تھے' اصولی طور پر اس سمجھوتے کے خلاف تھے اس لئے ان کو وزارت سے فارغ کر دیا گیا۔ چنانچہ جب وزارت چھوڑ کر ملک کے طول و عرض میں دورے کئے تو نوجوان طبقہ ان کے گرد جمع ہو گیا۔ ایوب نے بھٹو کو ختم کر دینے کی دھمکی دی لیکن اس نوجوان لیڈر کو ایوب خان کا زوال نوشتہ دیوار کی طرح صاف نظر آرہا تھا اس لئے اس کا حوصلہ بلند رہا۔ ایوب نے فوج بلائی لیکن گلی گلی تاشقند کے خلاف نعرے لگ رہے تھے اور عوام ایوب کی قیادت کو کوس رہے تھے۔ تاشقند پر مخالف سیاسی جماعتوں نے یک زبان ہو کر تنقید کی 'اس تنقید میں اوّلیت مسٹر بھٹو نے کی اور یہی مغربی پاکستان میں اُس کی لیڈر شپ کی اساس بنی۔

مجیب الرحمان کا چھ نکاتی پروگرام

۱۹۶۶ء کے اوائل میں لاہور میں ایک آل پارٹیز میٹنگ ہوئی جس میں مشرقی پاکستان سے صرف مجیب الرحمان بطور نمائندہ عوامی لیگ شامل ہوا۔ جب اس کو ایوب خان کے خلاف جذبات کا صحیح اندازہ ہوا

اور اپنی سیاست کے لئے فضا ساز گار محسوس ہوئی تو اس نے آئین میں ترمیم کا ایک چھ نکاتی پروگرام پیش کیا۔ یہ چھ نکات مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔ ۱۹۴۰ء کے لاہور ریزولیشن کے مطابق پاکستان ایک وفاق ہونا چاہئے جس میں دونوں حصوں (یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان) کے حقوق برابر ہوں۔

۲۔ دونوں حصوں کا سکہ (کرنسی) الگ الگ ہو لیکن دونوں میں تبادلہ کھلا رکھا جائے۔ مشرقی پاکستان کی مالیاتی پالیسی الگ ہو۔

۳۔ ہر وفاقی یونٹ کو ٹیکس لینے کا اختیار ہو اور وفاق کو ایسا اختیار نہ ہو۔ وفاقی یونٹ وفاق کی مالی ضروریات پوری کریں۔

۴۔ وفاقی حکومت کا دائرہ کار صرف دفاع اور امور خارجہ ہو۔

۵۔ غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدن کا الگ الگ حساب کتاب ہو۔ ہر وفاقی یونٹ بیرون ملک آزادانہ تجارتی تعلقات رکھ سکے۔

۶۔ مشرقی پاکستان کی اپنی الگ نیم فوجی تنظیم ہو۔

مجیب الرحمان کا چھ نکاتی پروگرام پاکستان کی مختصر تاریخ میں نہایت نمایاں مقام رکھتا ہے۔ پاکستان کی فوج کے اقتدار اور آمرانہ حکومت سے نالاں بنگالی عوام سمجھتے تھے اب ان کے نئے وفاق کے اقتدار میں کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔ فوج تمامتر مغربی پاکستان سے ہے لٰہذا جب بھی یہ اقتدار پر قبضہ کرے گی لامحالہ اقتدار کا مرکز مغربی پاکستان بن جائے گا اور مشرقی پاکستان ایک نو آبادی میں بدل جائے گا۔ مجیب الرحمان کا چھ نکاتی پروگرام اسی بے اطمینانی، غم و غصہ کا آئینہ دار تھا۔ مشرقی پاکستان سے جو لوگ ایوب کی حکومت میں شامل ہوئے یا شامل کئے گئے وہ کسی طرح بھی عوام کے نمائندے نہیں کہلا سکتے تھے۔ کچھ پولیس افسر تھے، دو ایک دوسرے محکموں کے جونیئر افسر تھے اور ایک یا دو گھسے پٹے ہوئے سیاستدان، جن کو بنگالی عوام ایک عرصے سے سیاسی زندگی سے معزول کر چکے تھے اور جن کا ذاتی کردار نہایت قبیح تھا۔ چنانچہ یہ خدشہ بھی ان کے دل میں تھا کہ ایوب خان کبھی عوام کے صحیح نمائندوں کو آگے نہیں آنے دے گا۔ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ جب فوجی افسران نے ایک بار ملک میں اقتدار کا مزہ چکھ لیا تو وہ بار بار اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ لٰہذا مجیب الرحمان کا چھ نکاتی پروگرام اس نظام کے خلاف ایک دھماکہ دار احتجاج تھا جو قومی افق پر نمودار ہوا۔

عبدالولی خان اور دیگر نیشنل عوامی پارٹی کے لیڈر خود بھی علاقائی خود مختاری کے حامی تھے لٰہذا انہوں نے مجیب کے پروگرام کی تائید کی۔ مغربی پاکستان کی باقی تمام پارٹیوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ یہ ملک کو توڑنے کی سازش ہے جس کی پشت پناہی ہندوستان اور مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی بہت بڑی

اقلیت کر رہی ہے۔ ایک سازش کیس، جو بعد میں اگرتلہ سازش کیس کے نام سے مشہور ہوا، قائم ہوا۔ بنیاد اس مقدمے کی یہ تھی کہ ہندوستان میں مشرقی پاکستان کی سرحد کے قریب واقعہ شہر اگرتلہ میں مجیب الرحمان اور اس کے ساتھیوں نے ہندوستان کی حکومت کے نمائندوں کے ساتھ سازش کی اور مشرقی پاکستان کو ایک الگ ملک بنانے کا پروگرام بنایا۔ اس کیس میں مجیب الرحمان اور دیگر چند بنگالیوں کو حراست میں لے لیا گیا۔ مقدمہ کی سماعت کے لئے ایک خاص ٹریبونل مقرر ہوا اور سماعت بند کمرے میں شروع ہوئی۔ ۔ ایوب خان کے اشارے پر سماعت کو طویل کر دیا گیا۔ یہ کرنا آسان تھا کیونکہ سرکاری وکیل جب چاہے سماعت ملتوی کرا لیتا تھا۔ مصلحت یہ تھی کہ لوگوں کی توجہ اس سازش اور مقدمے پر مبذول ہو اور ایوب خان کی مخالفت کو بھول کر لوگ ملک کی سلامتی کی فکر کرنے لگیں۔ ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے بھانپ لیا کہ یہ مقدمہ جان بوجھ کر لمبا کیا جا رہا ہے۔ چہ میگوئیاں ہوئیں، بات سے بات نکلی۔ آخر کار عوام ایک بپھرے ہوئے دریا کے سیلاب کی طرح عدالت پر ٹوٹ پڑے۔ جج صاحبان کی رہائش گاہوں پر حملے ہوئے اور جج بیچارے اپنی اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جسٹس ایس اے رحمان (مرحوم) جو اس ٹریبونل کے چیئرمین تھے ننگے پاؤں بھاگ کر ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو ایک بڑا جلوس ان کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتا ہوا ان کے تعاقب میں تھا۔ اگر وہ بروقت جہاز پر سوار نہ ہو جاتے تو ان کے لئے حشر ہو جاتا۔

اسی اثناء میں ایوب خان کو دل کا دورہ پڑا۔ حکومت کی دعوت پر شاہ ایران پاکستان آیا ہوا تھا اور ایوب کے ہمراہ ملک کا دورہ کر رہا تھا جب یہ سانحہ ہوا۔ ایوب کی بیماری کے دوران حکومت کا کاروبار رُکنا شروع ہو گیا کیونکہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں فیصلہ صدر ہی دینے کا مجاز تھا۔ ایک شخص کی ذات میں تمام اختیارات کا ارتکاز کتنی ناقابل عمل پالیسی ہے اس کا ادراک ایوب سمیت اس کی پوری انتظامیہ کو خوب ہوا۔ عوام میں بھی ایسی شخصی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھرے۔ حزب مخالف کو موقعہ راس آیا۔ انہوں نے ایوب خانی آئین میں ترامیم کے لئے باقاعدہ مہم شروع کی۔ بنیادی جمہوریت کا خاتمہ، براہ راست انتخابات، صدارتی نظام اور انتظامی ریاست کو ویسٹ منسٹر ٹائپ جمہوریت میں تبدیل کرنے کے مطالبے کئے گئے۔ سول ملازمین جن کو ایوب کا قرب حاصل تھا بہت سٹ پٹائے۔ ایوب کو خوش کرنے اور عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے انہوں نے ایک نیا ڈھونگ نکالا۔ ایوب کے دس سالہ دور حکومت کو پاکستان کی ترقی کا سنہرا باب بنا کر دکھانے کا ایک نہایت پرشکوہ پروگرام بنایا گیا۔ ملک بھر میں جشن منائے جانے لگے۔ عوام پہلے سے ہی بھرے بیٹھے تھے۔ ان جشنوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور لوگ احتجاج کرنے کے لئے پھر گلیوں بازاروں میں نکل آئے۔ ۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو ملک کے دونوں حصوں میں طلبہ، مزدور، سیاسی کارکن سب کے سب جوق در جوق نکلے۔ پانچ ماہ تک یہ جلسے جلوسوں کا سلسلہ چلتا

رہا۔ بہت سے لوگ مارے گئے، بہت سے زخمی ہوئے اور گرفتاریوں کی تعداد تو ہزاروں سے بھی تجاوز کر گئی۔ سب کا ایک ہی نعرہ تھا کہ ایوب کو ہٹایا جائے۔ جب سول حکومت احتجاج کے اس طوفان سے نپٹنے میں ناکام ہو گئی تو عجلت میں ایک گول میز کانفرنس بلانے کا انتظام کیا گیا۔ جنرل موسیٰ نے جو جنرل یحییٰ کے پیشرو تھے، جنگ کو ۲۷ اپریل ۱۹۸۴ء کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ

> یحییٰ خان کی زیر کمان فوج نے امن قائم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" دراصل یحییٰ خان نے سیاسی لیڈروں کے ساتھ گفتگو کے لئے بلائی گئی گول میز کانفرنس کو بھی سبوتاژ کیا اور اپنے خاص اثر سے احتجاج کرنے والوں کے لئے بھی آسانیاں پیدا کیں۔

مجیب الرحمان کو جو اس وقت تک اگرتلہ کیس میں زیر حراست تھا، گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی اس کے لئے ضمانت پر رہائی کا بندوبست کیا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک اگرتلہ کیس واپس نہ لیا جائے وہ کسی تعاون کے لئے تیار نہیں۔ ایوب خان کو ماننا پڑا اور کیس ختم کر دیا گیا۔

ایوب اصولاً مان گیا کہ آئین میں ترامیم کی جائیں اور صدارتی نظام کی جگہ پارلیمانی نظام قائم ہو۔ اس کے وفادار سول افسران نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یحییٰ خان کی بدولت فوج سے بھی وہ کٹ گیا۔ بیچارہ ایوب خان ایک المناک تنہائی کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ جاہ و جلال کا دلدادہ، مصاحبوں کی حمد و ثنا کا عادی فیلڈ مارشل محمد ایوب خان جسے دن رات بتایا جاتا تھا کہ وہ دس کروڑ پاکستانیوں کے دلوں کی دھڑکن ہے، ان کے دکھوں کے لئے مسیحا ہے، جب گرا تو پھر اٹھ نہ سکا۔ ۲۴ مارچ ۱۹۶۹ء کو اس نے اپنے عہدے اور سیاست سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا لیکن پرامن طریقے سے اقتدار عوام کے نمائندوں کو سونپنے کی بجائے یحییٰ خان کے حوالے کیا۔

> "بریگیڈیئر اے۔ آر۔ صدیقی نے اپریل ۱۹۸۵ء کے ڈیفنس جرنل میں لکھا" ایک سپاہی ہونے کے باوصف ایوب خان سیاست کے شعور سے عاری تھا لیکن تھا متکبر۔ اس نے عوامی جمہوریت کی جگہ ملک میں ایک تجارتی اور نیم صنعتی نظام قائم کرنے کی کوشش کی اور اس میں ناکام ہوا۔ سیاست سے مبّرا ایک خالص معاشیاتی نظام بربریت پیدا کرتا ہے جس میں غریب عوام کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جمہوریت پر مبنی سیاسی نظام عوام کو ملک کے انتظام میں شمولیت کی دعوت دیتا ہے۔ ایسے سیاسی نظام کی معاشیات اطمینان بخش ہوتی ہے۔ جہاں نمائندہ حکومت اور عوام کی شمولیت نہیں وہاں ہر چیز اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔"

دوسرا مارشل لاء

ایوب کی طرح یحیٰ خان بھی ایک عرصے سے اس دن کے لئے تیاری میں مصروف تھا اس نے بھی اپنے اعتماد کے افسروں کو ترقیاں دے کر اہم عہدوں پر تعینات کر رکھا تھا۔ دیگر ہر قسم کی تیاری تھی۔ چنانچہ حکومت پر قبضہ کرتے ہی اس نے اپنے صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہونے کا اعلان کر دیا۔ ایوب خان کا نافذ کردہ آئین منسوخ کر دیا اور ایک نیا LEGAL FRAME WORK ORDER جاری کر دیا جس کے ذریعے اہم آئینی فیصلے کر دیئے گئے۔ ان فیصلوں کی تفصیل قارئین پچھلے باب میں دیکھ چکے ہیں۔ ایوب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کثیر تعداد میں سرکاری ملازمین کو ریٹائر یا برخاست کر دیا اور سیاستدانوں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا۔ کرفیو' اسلحہ بردار فوجیوں کا گشت' فوجی عدالتیں اور مارشل لاء کا باقی سب کاروبار پھر سے نافذ ہوا۔ مغربی پاکستان میں ون یونٹ کو توڑ کر سابقہ چاروں صوبے بحال کر دیئے گئے۔ فرنٹیئر ' پنجاب' سندھ اور بلوچستان میں پھر سے صوبائی حکومتیں بن گئیں۔

بنیادی جمہوریت کے نظام کے خاتمے اور براہ راست انتخابات نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کے مقابلے میں مستقل اکثریت قرار دے دیا۔ الیکشن میں ایسا ہی ہوا۔ مجیب الرحمان کی عوامی لیگ نے پوری کی پوری ۱۶۹ نشستیں جیت لیں۔ لیکن جب یحیٰ آئینی ترامیم کر رہا تھا تو اس کو قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ الیکشن کے نتائج ایسے ہوں گے۔ اس نے تو نہایت مختلف منصوبہ بنا رکھا تھا جو ان نتائج کی وجہ سے مکمل طور پر شکست و ریخت ہو کر رہ گیا۔ ڈائریکٹر انٹیلی جنس مسٹر ایس۔ این۔ رضوی اور نیشنل سکیورٹی سیل NATIONAL SECURITY CELL کے سربراہ نے یحیٰ خان کو یقین دلا رکھا تھا کہ الیکشن کے نتیجے میں بیشتر منتخب ہونے والے ارکان اس کے پیروکار ہوں گے۔ خود رضوی نے ایک پاکستانی سفیر سے جو کسی غیر ملک میں تعینات تھا بڑے دعوے سے کہا وہ ملک میں ایک ایسی حکومت کو تشکیل دینے میں منہمک ہے جو عرصہ دراز تک قائم رہے گی۔ یہ اشارہ جنرل یحیٰ کی حکومت کی طرف تھا جو ان حضرات کی وساطت سے پندرہ سال تک قائم رہنی تھی اور جس کے لئے آئین میں یحیٰ کے لئے اسی مدت کی صدارت کی شق رکھی گئی تھی۔ الیکشن کے نتائج کو اپنے منصوبے کے مطابق ڈھالنے کے لئے یحیٰ خان نے ان حضرات 'یعنی رضوی اور ساتھیوں کو روپیہ اکٹھا کرنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تین کروڑ روپیہ جمع کیا جو مختلف بینکوں کے ان کا نام خفیہ کھاتوں میں رکھا۔ بیشتر رقم صنعتکاروں اور تاجر برادری سے لی گئی۔ اس رقم سے یحیٰ خان کے وفادار امیدواروں کی انتخابی مہم چلانا مقصود تھا۔ اس کثیر رقم میں سے کتنا خرچ الیکشن پر ہوا واللہ اعلم بالصّواب۔ راؤ رشید نے لکھا ہے کہ جب یحیٰ کی حکومت توڑ دی گئی' رضوی وغیرہ حراست میں لے لئے گئے اور ان کی تلاشیاں لی گئیں تو کچھ حصہ اس رقم کا رضوی کے ہاں سے برآمد ہوا۔

یحییٰ خان کو یہ بھی امید تھی کہ وہ ملک میں کثیر تعداد پارٹیوں کی آپس میں چپقلش کا فائدہ بھی اٹھاتا رہے گا۔ ہنری کسنجر نے اپنی کتاب MY WHITE HOUSE YEARS میں یوں لکھا ہے۔

"مجھے یحییٰ سے یہ پوچھنے کا موقع ملا کہ الیکشن کے بعد صدر کے اختیارات کیا ہوں گے۔ یحییٰ نہایت مطمئن اور پر اعتماد تھا۔ اسے امید واثق تھی کہ ملک کے دونوں حصوں میں بہت سی پارٹیوں کے منتخب نمائندے اسمبلی میں آئیں گے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ صدر ہی ان کے درمیان ثالث ہو گا۔ لہٰذا پاکستان کی سیاست میں حرف آخر صدر ہی کا ہو گا۔"

یہ توقعات اور منصوبے اس سربراہ ریاست اور چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کے تھے، جس نے ملک پر طاقت کے زور سے قبضہ کیا اور اس منصب اقتدار کا جواز یہ دیا کہ وہ ملک سے سازشوں، بدنظمی اور بددیانت سیاست کو ختم کرنے کے لئے حکومت کی باگ ڈور سنبھال رہا ہے۔ جب دسمبر ۱۹۷۰ء کو الیکشن ہوئے تو نتائج بڑے حیران کن ثابت ہوئے۔ سب سے زیادہ حیرت تو خود امیدوار پارٹیوں کے سربراہوں کو ہوئی۔ مجیب الرحمان کو بھاری اکثریت کی امید تو تھی لیکن اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تمام کی تمام نشستوں پر اس کی پارٹی کے امیدوار کامیاب ہوں گے۔ البتہ مغربی پاکستان میں اسے کوئی نشست نہ مل سکی اور نہ ہی شاید اسے ایسی کوئی امید تھی۔ مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے صدر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا اپنا اندازہ تھا کہ تیس یا پینتیس نشستیں پارٹی کے امیدوار جیت جائیں گے۔ اطلاعات فراہم کرنے والی ایجنسیوں کی بھی یہی رپورٹیں تھیں۔ الیکشن ہوئے تو پی پی پی کو ۸۱ نشستوں پر کامیابی ہوئی جو بھٹو سمیت تمام پارٹی کے لئے مسرت اور حیرت کا موجب بنی۔ جہاں تک یحییٰ کا تعلق ہے وہ تو بالکل دم بخود ہو کر رہ گیا۔ اس کے وفادار امیدواروں میں سے ایک بھی کامیاب نہ ہوا اور وہ تمام رقوم جو ان کی انتخابی مہم کے لئے دی گئی تھیں ضائع ہو گئیں۔ اب مشرقی اور مغربی پاکستان میں دو بڑی پارٹیاں واضح اکثریت لے کر الیکشن جیت گئیں تو کون کس سے لڑے جھگڑے گا اور صدر کی ثالثی حیثیت کب کام آئے گی۔ تین دن تک یحییٰ خان کے منہ سے ایک لفظ بطور تبصرہ، تعریف یا اطمینان کے اظہار کا نہ نکل سکا، اور نکلتا بھی کیسے۔ اس کا سارا ریت کا گھروندہ گر کر خاک میں مل چکا تھا۔

مجیب نے اپنے چھ نکاتی پروگرام پر الیکشن جیتا اور اس کی جیت بھی اس قدر مکمل تھی کہ اب اگر وہ چاہتا بھی تو اپنے پروگرام میں کوئی تحریف نہ کر سکتا۔ لہٰذا یہ چھ نکاتی پروگرام اب مجیب کے گلے میں ایک تختی بن کر لٹک گیا۔ LEGAL FRAMEWORK ORDER کے تحت منتخب اسمبلی نے ۱۲۰ دن کے اندر نیا آئین بنانا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اپنی واضح اکثریت کی بنا پر مجیب الرحمان آئین میں چھ نکاتی پروگرام کو حرف بحرف سمو دے گا۔ علاوہ بریں بنگالی عوام دیکھ چکے تھے کہ پاکستانی فوج ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان

کے دفاع سے قطعاً قاصر تھی اور آئندہ بھی کسی ایسی صورت میں فوج سے مشرقی پاکستان کے دفاع کی توقع عبث تھی۔ فوج کا مؤقف یہ سمجھا جاتا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لئے جنگ مغربی محاذ پر ہی لڑی جا سکتی ہے۔ یہ مؤقف ظاہر ہے کہ بنگالیوں کے لئے باعث اطمینان نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس پر طرّہ یہ کہ فوج آئے دن اقتدار پر قبضہ کرنے کی عادی ہو چلی تھی اور پاکستان کے مستقل حاکم فوجی جرنیل ہی نظر آتے تھے۔ ادھر برسراقتدار فوجی ٹولے کو بھی بنگالیوں کے ان احساسات کا ادراک تھا۔ ان کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ وزیراعظم بن کر مجیب الرحمان فوج کے وہ شاہانہ بجٹ منظور نہیں ہونے دے گا جو ان کی عادت بن چکے تھے۔ ۶۰ فیصد بجٹ فوج پر خرچ ہوتا تھا۔ الیکشن کے سال میں یہ بجٹ ساڑھے باسٹھ کروڑ ڈالر تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ اگر مجیب اقتدار میں آ گیا تو وہ فوج کی قوّت کو توڑنے کی کوشش کرے گا اور ممکن ہے کہ اس کی حیثیت ہی بدل دے، اس نیت سے کہ آئندہ اس میں مارشل لاء لگانے کی سکت ہی نہ رہے۔

برسرِاقتدار فوجی حکام نے حالات کے مدّنظر یہ تو طے کر لیا کہ مجیب الرحمان کو کسی صورت بھی ایوان اقتدار میں قدم نہیں رکھنے دینا۔ وثوق سے کہا نہیں جا سکتا کہ اس مرحلے پر یا اس کے بعد یہ فیصلہ بھی کر لیا گیا کہ مشرقی پاکستان ایک ایسا خطہ ہے جہاں امن اور اطمینان ممکن نہیں لہٰذا اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے اور حکومت کا دائرہ مغربی پاکستان تک ہی محدود رکھا جائے کہ یہاں سکون سے مدت مدید تک بے خوف و خطر حکمرانی کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا کسی نہ کسی بہانے قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہوتا رہا۔ الزام ذوالفقار علی بھٹو کے سر دھرا جاتا ہے کہ اس نے یحییٰ خان کو یہ اجلاس ملتوی کرنے پر مجبور کئے رکھا اور مغربی پاکستان کے منتخب نمائندوں کو دھمکی دی کہ جو کوئی ڈھاکہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ ذوالفقار علی بھٹو تو حکومت میں شریک نہیں تھا۔ وہ فقط ایک سیاسی لیڈر تھا۔ اس کی پارٹی اپنی ۸۱ نشستوں کی بنا پر مجیب الرحمان کے ساتھ تقسیم اقتدار پر سمجھوتے کے لئے مصروف پیکار تھی۔ سیاستدان بسا اوقات ایسے مطالبے کرتے ہیں اور ایسی پوزیشن اختیار کرتے ہیں جو ظاہرا طور پر ناقابل عمل اور نامناسب ہو، لیکن یہ محض سیاست کی شطرنج کی چال ہوتی ہے، سودے بازی میں لے دے والی بات ہوتی ہے۔ جہاں تک قومی سطح پر سرکاری فیصلوں کا تعلق ہے یہ بلاشبہ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے اور کوئی بھی حکومت اپنے اس فرض یا ذمہ داری سے پہلوتہی کر کے اتنی بڑی سیاسی غلطی کا الزام کسی سیاسی لیڈر کے سر نہیں تھوپ سکتی، جو سیاسی لیڈر نہ تو ابھی تک اسمبلی کی رکنیت کا حامل ہو اور نہ ہی کسی اور قومی عہدے پر فائز۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ قومی اسمبلی کا اجلاس نہ بلانا کوئی فاش غلطی بھی نہیں کہی جا سکتی کیونکہ غلطی میں کسی فیصلے سے انحراف یا کوتاہی کا عنصر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی اور تھا فیصلہ تو ہوا ہی نہیں تھا کہ اسمبلی بلائی جائے یا بلائی جانی چاہئے۔ برعکس اس کے فیصلہ تھا کہ اسمبلی کو کسی طور بھی نہیں بلانا۔ بقول ڈاکٹر صفدر محمود ایک دانستہ تباہی DELIBERATE DEBACLE کی راہ اختیار کر لی گئی تھی۔ دکھاوے کے لئے

مجیب الرحمان سے گفت وشنید جاری رہی۔ اصرار ہوتا رہا کہ اپنا چھ نکاتی پروگرام ترک کر دے۔ یحییٰ خان کو بااختیار صدر تسلیم کرلے وغیرہ ۔ مدعا وہی تھا جو ایوب کا گول میز کانفرنس بلانے کا تھا۔

ادھر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے لیڈران، خصوصاً نوجوان طبقہ جو تاج الدین کے زیر اثر تھا بے چین ہو رہا تھا کہ انتخاب ہو جانے کے بعد اب اسمبلی کیوں نہیں بلائی جا رہی۔ تشدد کی سیاست پر تکیہ کرنے والے اس طبقہ نے ۷ مارچ کے لئے ایک جلسہ عام کا اعلان کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ بنگلہ بندھو (بنگالیوں کا دوست یعنی مجیب الرحمان) اس جلسہ سے خطاب کرے گا۔ چنانچہ طوعاً و کرہاً مجیب الرحمان کو اس جلسے میں آنا پڑا اور اس نے جلسے میں تقریر بھی کی۔ لیکن اس نے آزاد بنگلہ دیش کا جھنڈا جو موقع پر رکھا ہوا تھا، لہرانے سے انکار کر دیا۔ بلکہ اس نے اپنی تقریر کے آخر میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ بھی لگایا۔ جب مجیب الرحمان جلسے سے رخصت ہو گیا تو طلباء نے بنگلہ دیش کا جھنڈا بلند کیا اور نعرے لگائے۔ فرانسیسی پریس کے ایک نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے مجیب الرحمان نے کہا۔

> "کیا مغربی پاکستان والے اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتے کہ اس حصے میں صرف میں ہی ایک واحد شخص ہوں جو اشتراکیت کو روک سکتا ہے۔ اگر وہ لوگ زور آزمائی پر ہی تلے ہوئے ہیں تو میں اقتدار سے الگ کر دیا جاؤں گا اور نکسل باڑی لوگ NAXALITE میرے نام پر سیاست میں کود پڑیں گے (اور تباہی مچا دیں گے) اگر میں اپنے مؤقف سے ہٹتا ہوں تو میری ساکھ نہیں رہتی۔ میں کافی مشکل میں گرفتار ہوں"

یہ انٹرویو LE MONDE کے ۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء کے شمارے میں پیرس سے شائع ہوا۔

جنوری اور فروری ۱۹۷۱ء کے دوران گاہ بگاہ یحییٰ خان اکیلا یا مغربی پاکستانی لیڈروں کے ساتھ مجیب الرحمان اور عوامی لیگ لیڈروں سے ملتا رہا۔

مغربی پاکستان اور عوامی لیگ کے لیڈروں کے درمیان براہ راست گفت و شنید بھی جاری رہی۔

جی ڈبلیو چودھری نے اپنی کتاب "پاکستان کے آخری ایام" میں دعویٰ کیا ہے کہ

> "یحییٰ اور مجیب کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ تھا جس کی رو سے یحییٰ خان کو صدر پاکستان رکھنا طے تھا۔ لیکن معاہدہ کرتے وقت مجیب کو اپنی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ جب الیکشن میں اسے اتنی نشستیں مل گئیں کہ بغیر کسی اور پارٹی یا فرد کی مدد کے اسے اسمبلی میں مستقل اکثریت حاصل تھی تو وہ اپنے وعدہ پر قائم نہ رہا۔ چنانچہ یحییٰ خان نے قسم کھائی کہ وہ مجیب کو اس وعدہ خلافی کا مزہ چکھائے گا"۔

عوامی لیگ والوں نے بدلتے ہوئے حالات اور جنوری فروری کی کارروائی سے صحیح اندازہ لگا لیا کہ ٹال مٹول ہو رہی ہے اور فوج بڑے

پیمانے پر کسی حملے کی تیاری میں مصروف ہے۔ ایک طویل عرصے سے عوامی لیگیوں کا ہندوستان سے گٹھ جوڑ تھا۔ انہیں احساس تھا کہ ایک دن فوج کے ساتھ ان کی ٹھن کر رہے گی۔ لہٰذا انہوں نے ہندوستان کی مدد سے حالات سے نپٹنے کے لئے پوری تیاری کر رکھی تھی۔ انہوں نے اپنی خفیہ نیم فوجی تنظیم مکتی باہنی (آزادی کی فوج) کو میدان میں اتار دیا۔ مکتی باہنی ایسٹ پاکستان رائفلز EAST PAKISTAN RIFLES —— جس کا کام سرحد کی حفاظت کرنا تھا' میں سرایت کر چکی تھی' اس نیم فوجی تنظیم کے بیشتر بنگالی افسر اور جوان مکتی باہنی سے ملے ہوئے تھے۔ حالات کا رخ دیکھ کر سول انتظامیہ بھی مجیب کی طرف کروٹ بدل گئی اور صوبے کے ملٹری گورنر سے پہلوتہی کرنے لگی۔ اشارہ پا کر مکتی باہنی نے صوبہ بھر میں مقرر کردہ نشانوں پر حملے شروع کر دیئے۔ مواصلات کا نظام درہم برہم کر دیا گیا۔ جگہ جگہ بجلی کا نظام فیل کر دیا گیا۔ مغربی پاکستان کے کئی افسران قتل کر دیئے گئے۔ بہاری بیچارے تو خاص طور پر نشانہ بنے۔ میمن سنگھ' ڈھاکہ' چٹا گانگ اور دیگر شہروں میں بہاریوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ان کی بستیاں جلا دی گئیں۔ ادھر راولپنڈی میں جی ایچ کیو ابھی اپنی تیاریوں میں ہی الجھا ہوا تھا۔ اب ہوائی جہازوں کی خاص اڑانوں سے سپاہ مشرقی پاکستان پہنچائی گئی۔ گولہ بارود بھی بھیجا گیا۔ ایڈمرل احسن نے جو مشرقی پاکستان میں ملٹری گورنر تھا' مجیب الرحمان کے ساتھ گہرے تعلقات پیدا کر رکھے تھے چنانچہ اس کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ جنرل ٹکا خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ اس وقت ڈھاکہ میں یہ حالات تھے کہ جنرل ٹکا خان کو گورنر بننے کیلئے کوئی ہائی کورٹ کا جج اسے حلف دینے کیلئے تیار نہ ہوا لہٰذا مغربی پاکستان سے ایک جج کو بھیجنا پڑا۔ ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان ڈھاکہ پہنچا اور مجیب الرحمان سے گفت و شنید شروع ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر چند مغربی پاکستان کے لیڈر بھی گئے۔ دس دن تک مذاکرات جاری رہے لیکن فریقین کے درمیان کوئی فیصلہ کن بات نہ ہو سکی اور نہ ہی سیاسی تعطل کا کوئی حل ملا۔ ادھر درست بات تو یہ ہے کہ حل ڈھونڈنے کی کوئی سنجیدہ کوشش بھی نہیں کی گئی۔ کم از کم یحییٰ خان کی طرف سے تو نہیں۔

مشرقی پاکستان میں پولیس ایکشن

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء ملک کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن دن تھا۔ یحییٰ خان کے کمانڈروں نے رپورٹ دی کہ انہوں نے صوبے بھر میں پوزیشنیں سنبھال لی ہیں' تمام مقامی کمانڈر اپنے اپنے ہدف سے واقف ہیں اور جوابی کارروائی کے لئے ہر طرح سے تیار ہیں۔ چنانچہ یحییٰ خان اور دیگر مغربی پاکستان کے لیڈر اسی رات بغیر اطلاع' خاموشی سے ڈھاکہ سے روانہ ہو کر کراچی چلے گئے۔ ان کے جانے کے فوراً بعد فوج نے صوبے بھر میں ہر اس مقام پر جہاں مدافعت کے لئے مکتی باہنی موجود تھی حملہ کیا۔ مکتی باہنی ظاہر ہے کہ ایسے

بھرپور حملے کے سامنے ٹھہرنے کے قابل نہیں تھی اس لئے پسپا ہوئی اور اس طرح ان کے بیشتر اڈے صاف اور خالی ہو گئے۔ ایک ایسا اڈہ ڈھاکہ یونیورسٹی بھی تھا جو مکتی باھنی کا خاص ہیڈ کوارٹر اور اسلحہ بارود کا گودام تھا۔ اسے بھی خالی کرالیا گیا۔ یونیورسٹی بند کر دی گئی۔ ڈھاکہ پولیس بھی مکتی باھنی کے ساتھ بُری طرح سے ملوّث تھی۔ چنانچہ پولیس لائن پر فوج نے حملہ کر کے پولیس کا تمام اسلحہ بارود قبضے میں لے لیا۔ حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق اس ایکشن میں چند سو انسان مارے گئے۔ مکتی باھنی کا دعویٰ تھا کہ کئی ہزار لوگ شہید ہوئے۔ اصلیت ان دونوں اعداد کے بین بین ہے۔ مجیب الرحمان کو گرفتار کر کے مغربی پاکستان بھجوا دیا گیا۔ باقی عوامی لیگ کے لیڈر جن میں ریٹائرڈ کرنل ایم اے جی عثمانی بھی شامل تھا بھاگ گئے۔ ہندوستان میں سرحد کے قریب ان لوگوں کے لئے پہلے سے تیار کئے ہوئے کیمپ موجود تھے، چنانچہ منصوبہ بندی کے مطابق یہ حضرات وہاں براجمان ہو گئے۔ صوبہ کی پولیس کی کل نفری چھتیس ہزار تھی۔ ان میں سے تین چوتھائی اپنا اپنا اسلحہ لے کر بھاگ گئے اور مکتی باھنی سے جا ملے۔ ہزارہا دیگر رضا کار صوبے سے بھاگ کر ہندوستان کے کیمپوں میں منتقل ہو گئے جو اسی موقع کے انتظار میں تھے۔ یہاں ان رضا کاروں کو گوریلا جنگ اور تخریب کاری کی تربیت دی جاتی تھی۔ یہ تربیت یافتہ مکتی باھنی کے رضا کار سرحد پار کر کے مشرقی پاکستان آتے تھے اور دیئے ہوئے ہدف TARGET کو تباہ کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ بعض کا مشن فوج کے چھوٹے چھوٹے دستوں پر گوریلا ٹائپ کا حملہ کرنا ہوتا تھا۔ جہاں کوئی چھوٹی چوکی ہوئی یا کوئی گشت نظر آیا، اچانک حملہ کیا، دو ایک کو مارا اور بھاگ گئے۔ بیشتر پل بارود سے اڑا دیئے گئے۔ مواصلات کا سلسلہ منقطع ہو گیا جس کی وجہ سے نہ صرف فوج کی نقل حرکت مشکل ہو گئی بلکہ اندرون ملک خوراک کی بہم رسانی بھی ناممکن ہو گئی۔ پولیس کا رویہ دیکھ کر حکومت نے باقی ہتھیار اسلحہ بھی جو تھانوں وغیرہ میں تھا ضبط کر لیا۔ پولیس میں سے نوجوان طبقہ تو بھاگ گیا تھا۔ بوڑھے بوڑھے لوگ رہ گئے تھے۔ اسلحہ چھن جانے سے یہ اور بھی کمزور ہو گئے۔ مکتی باھنی کے لئے تھانوں پر حملہ کرنا آسان ہو گیا۔ چنانچہ تھانوں میں پولیس خود سخت ہراساں اور خوفزدہ ہو گئی۔ حکومت کا اعتماد پولیس پر سے اُٹھ چکا تھا۔ مکتی باھنی ان کو حکومت کے ٹوڈی سمجھتی تھی۔ دونوں اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان حالات میں بیچاروں نے عوام کے جان و مال کی حفاظت تو کیا ہی کرنی تھی خود ان کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔

وسط مئی ۱۹۷۱ء میں مجھے بطور انسپکٹر جنرل پولیس مشرقی پاکستان تعینات کر کے بھیجا گیا۔ ڈھاکہ روانہ ہونے سے قبل میں ایک اور پولیس افسر کے ہمراہ سید نذیر احمد رضوی کے پاس گیا تاکہ مشرقی پاکستان کے متعلق کوئی خاص ہدایت ہو تو لے لی جائے۔ رضوی اس وقت انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر تھے۔ مشرقی پاکستان کے ہنگاموں میں ان کا داماد قتل ہو گیا تھا۔ مجھے جو ہدایت رضوی صاحب نے دی بہت مختصر



ایم۔ اے۔ کے چودھری اور سابق مشرقی پاکستان کے پولیس افسران

اور عجیب تھی۔ کہا کہ اپنے ساتھ بہت سے نوجوان پٹھان سپاہی لے جاؤ اور وہاں ان کو کھلا چھوڑ دو تا کہ آئندہ بنگالی نسل نیلی آنکھوں والی پیدا ہو۔ رضوی چونکہ اپنے داماد کی موت پر سوگوار تھے میں نے ان کی بات کو اس صدمے کا نتیجہ سمجھ کر سنی ان سنی کر دیا۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ دل سے کہہ رہے تھے۔

نتیجہ ان حالات کا یہ ہوا کہ صوبے کے عوام ایک مسلسل خوف و ہراس میں دم بخود ہو کر بیٹھ گئے۔ نوجوان جو مکتی باھنی میں شامل نہیں تھے، حکومت کے اقدام سے ناراض تھے اور پاکستان سے متنفر۔ بوڑھے اپنے بچوں کے مستقبل کے بیسے خوفزدہ اور نا امیدی میں مبتلا تھے۔ معاشی سرگرمی منجمد ہو گئی۔ خوراک کی نقل و حرکت کچھ تو مواصلات کے درہم برہم ہونے سے مشکل ہو گئی تھی کچھ مکتی باہنی کی لوٹ مار کی وجہ سے مزید دشوار ہو گئی۔ نتیجتہً شمال کے چند ضلعوں میں قحط کی صورت پیدا ہو گئی۔ جگہ جگہ بجلی گھروں اور بڑے کھمبوں PYLONS کو اڑا دیا گیا۔ اکا دکا وارداتیں بڑے بڑے شہروں میں بشمول ڈھاکہ ہونے لگیں۔ صوبے میں اور کئی محفوظ مقامات KEY POINTS پر حملے ہوئے۔ فوج جگہ جگہ ان حملوں کی مدافعت کرتی رہی لیکن اتنے بڑے صوبے میں اس کی نفری اس وسیع پیمانے پر تخریب کاری کو مکمل طور پر روک نہ سکی۔ بڑے شہروں میں تو روک تھام پر زیادہ توجہ دینی ضروری تھی کیونکہ شہروں میں ہراس۔ سیاسی طور پر حکومت کے لئے باعث نقصان ہوتا ہے۔ لہٰذا شہروں میں فوج کی نفری بڑھا دی گئی اور دیہاتوں کو مکتی باھنی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ اس صورت حالات میں مکتی باہنی زیادہ مضبوط ہو گئی اور آہستہ آہستہ زیادہ نڈر اور بے باک بھی، کیونکہ اب اسے دیہاتوں میں پناہ گاہیں مل گئیں، خوراک مل گئی اور وسیع علاقہ مل گیا۔ شمال میں کچھ حصے ایسے بھی تھے جہاں مکتی باھنی کے ساتھ باقاعدہ ہندوستانی فوج کے دستے موجود تھے اور یہ علاقہ مارشل لاء حکومت کی عملداری سے نکل گیا ہوا تھا۔ ان حالات کا ماحصل یہ تھا کہ سال کے وسط میں مشرقی پاکستان کے شہروں پر فوج کا قبضہ تھا اور دیہاتوں میں مکتی باھنی دندناتی پھر رہی تھی۔ شہروں میں مقابلتاً امن ہو چلا تھا۔

حالات کے اس موڑ پر فوج نے مزید سختی شروع کر دی۔ مکتی باھنی یا اس کے خفیہ مدد گاروں کی تلاش اور تفتیش کی خاطر لوگوں کو گرفتار کرنے، ان پر تشدد کرنے اور گاہے بگاہے ہلاک تک کر دینے کی اطلاعات آنے لگیں۔ ایسے گرفتار شدگان میں اکثر اوقات کم عمر نوجوان بھی شامل ہوتے تھے۔ پھر ایک عام معافی کا اعلان ہو گیا۔ وہ ہزاروں لوگ جو ڈر کر ملک سے فرار ہو گئے تھے، یا جو مکتی باہنی میں بھی شامل تھے سب کو اس اعلان میں دعوت دی گئی کہ وہ واپس آ جائیں اور آ کر اپنا کاروبار زندگی سنبھال لیں۔ ان مہاجرین کے آنے کے راستے متعین ہو گئے، ان کے لئے ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا گیا اور سرحد پر ان کے استقبال اور تصدیق کے لئے کیمپ بھی لگائے گئے۔ لیکن خلاف توقع بہت کم لوگ واپس آئے۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ باوجود اعلان معافی کے فوج کی تلاش اور تفتیش کا سلسلہ جاری تھا اور دوسرے

بھارت والوں نے مہاجروں کو سختی نرمی ' ہر حربہ استعمال کر کے روکے رکھا کیونکہ یہ مہاجرین پاکستان کے خلاف ایک منہ بولتا پروپیگنڈا تھے۔ بھارت کے عزائم اور منصوبہ بندی میں ان کا ایک اہم مقام تھا۔ اس لئے ایکا ایکی اتنے بڑے مہاجر کیمپوں کو ختم ہونے دینا بھارت کی حکمت عملی کے خلاف تھا اور وہ اس کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسی دوران بھارت میں مشرقی پاکستان پر بھرپور حملے کی تیاریاں ہوتی رہیں۔

پی آئی اے کے ایک ملازم پر مکتی باہنی سے رابطہ رکھنے کا شبہ تھا اور اس کی گرفتاری مطلوب تھی۔ گرفتار کرنے والی پارٹی نے گھر کے تمام مرد پکڑ لئے۔ ان میں سے اس لڑکے کا ستر سالہ ذیابیطس کا مریض باپ اور ایک سرکاری ماہر امراض چشم ڈاکٹر بھی شامل تھے۔ مجھے علم ہوا تو آدھا دن لگا کر اور گورنر ٹکا خان کی مداخلت سے بیچارے بے گناہ افراد کو رہا کروایا۔ جب تک یہ لوگ رہا ہوئے ذیابیطس کا بوڑھا مریض قریب المرگ ہو چکا تھا۔

ایک دن اطلاع آئی کہ ڈھاکہ کے مضافات میں ایک دھماکہ ہوا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ گاؤں کے تمام مردوں کو سڑک پر منہ کے بل لٹایا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں پھیلا رکھے تھے۔ ان میں کئی سفید ریش باعزت لوگ بھی تھے۔ ایک افسران کے درمیان کھڑا اپنی قوّت کے مظاہرے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے کہنے پر ان لوگوں کو رہا کیا گیا اور وہ بیچارے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے۔

کئی ایک بنگالی پولیس افسر شک کی بناء پر گرفتار کر لئے گئے تھے۔ بہت سے دیگر افسران بھی اسی مد میں گرفتار تھے۔ ان افسروں کو ایک کیمپ جیل میں رکھا ہوا تھا جس کے گرد کانٹے دار تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ نہ تو ان افسروں پر کوئی مقدمہ چلایا جا رہا تھا اور نہ ہی انہیں چھوڑنے کا کوئی ارادہ نظر آتا تھا۔ میں نے گورنر سے بار بار کہا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے کیا جائے تاکہ ان بیچاروں کے خاندانوں میں تشویش ختم ہو۔ بالآخر گورنر نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر کیمپ جیل میں بھیجا کہ میں دریافت اور تفتیش میں مدد دوں۔ میری کاوش سے بہت سے افسران جن کے خلاف کوئی خاص شہادت نہیں تھی رہا ہو گئے۔

ٹکا خان باوردی جرنیل تھے اور گورنر بھی۔ لیکن ایسے معاملات میں ان کی سوچ بڑی مثبت تھی۔ اپنی ہفتہ وار سٹاف میٹنگ میں ایک دفعہ کہا '

"ہم نے زخم لگائے ہیں اور اب ہمیں کو ان پر مرہم رکھنا ہے "

نور الامین ' عبد الصبور ' مولوی فرید ' امجد حسین اور دیگر لیڈران جو مشرقی پاکستان میں موجود تھے اور سچے محب وطن تھے اکتوبر ۱۹۷۱ء تک کہتے رہے کہ اب بھی مصالحت کا پہلو نکل سکتا ہے۔ مانا کہ ہم الیکشن میں نہیں جیتے لیکن پھر بھی لوگ ہماری بات سننے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ جنرل یحیٰی خان یہاں آئے ' فوج کا دباؤ کم ہو اور گفت و شنید کا سنجیدہ آغاز کیا جائے۔ لیکن یحیٰی خان نے مشرقی پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھنے

سے ہی انکار کر دیا۔ روس اور انگلستان نے یحییٰ خان کو مشورہ دیا کہ مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائیوں میں نرمی کر دے۔ لیکن اس نے ان کو ضرورت سے زیادہ حقارت آمیز جواب دیئے جن کا خمیازہ خود اسے اور پاکستان کو بھگتنا پڑا۔

شاہ ایران نے ایران میں شہنشاہیت کے دو ہزار سالہ جشن کے دوران خاص ذاتی کاوش سے روسی لیڈر پڈگورنی PODGORNY اور یحییٰ خان کی ملاقات کا اہتمام کیا۔ مقصد اس ملاقات کرانے کا یہ تھا کہ یحییٰ خان کی روس کے ساتھ بلاوجہ تلخ کلامی سے جو بدمزگی پیدا ہو چکی ہے اس کا مدافع کیا جائے تاکہ مشرقی پاکستان کے مسئلے میں روس کی حمایت حاصل ہو سکے۔ شاہ ایران نے کلکتہ میں مقیم عوامی لیگ لیڈروں خصوصاً تاج الدین گروپ سے بھی رابطہ کیا کہ اگر پڈگورنی یحییٰ ملاقات کا کوئی مثبت نتیجہ نکلے تو ان کو ایران لے آیا جائے اور یحییٰ خان سے براہ راست مذاکرات کی تجدید ہو سکے۔ پڈگورنی سے ملاقات کا وقت صبح ساڑھے دس بجے کا رکھا گیا تاکہ یحییٰ خان علی الصبح شراب کے نشے میں نہ ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور اس ذات شریف کو سہارا دے کر روسی لیڈر کے خیمے تک لے جانا پڑا۔ پڈگورنی نے اس کے استقبال میں اسے مسٹر پریذیڈنٹ کہہ کر خطاب کیا۔ یحییٰ خان نے کہا "ایکسی لینسی EXCELLENCY آپ تو میرا ذکر ہمیشہ مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کہہ کر کرتے ہیں آج مسٹر پریذیڈنٹ کیسے کہہ دیا؟ پڈگورنی نے بدستور خوشگوار لہجہ میں کہا ایکسی لینسی آپ پریذیڈنٹ ہیں اس لئے آپ کو پریذیڈنٹ کہا۔ یحییٰ نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا اور کہا یہاں سے کہو (یعنی دل سے) پھر ہاتھ گلے پر لے گیا اور کہا یہاں سے نہیں (یعنی حلق سے)۔ پڈگورنی نے اس طرز کلام کو ہتک آمیز سمجھا اور بغیر ایک لفظ کہے خیمے سے باہر چلا گیا۔ چنانچہ یہ تاریخ ساز ملاقات اس طرح ختم ہوئی۔ وزارت خارجہ کے افسران جو ہمراہ تھے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اسی شام یحییٰ کی ایک ملاقات یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو MARSHAL TITO سے ہوئی۔ ملاقات کے فوراً بعد جب پریس والوں نے مارشل ٹیٹو سے ملاقات کے بارے میں سوالات کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا مشرقی پاکستان کے بچ جانے کی کوئی امید ہے تو اس ٹیٹو نے کہا آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ یحییٰ خان مشرقی پاکستان کو بچانے کے لئے سنجیدہ ہے؟۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی روس اور ہندوستان میں باہمی فوجی امداد کا معاہدہ ہو گیا اور اس کے بعد مشرقی پاکستان کے ساتھ جو کچھ ہوا کسے نہیں معلوم۔ ہندوستان نے ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان پر باقاعدہ حملہ کیا۔ صوبہ میں فوج ویسے ہی کم تھی۔ جو تھی وہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں جگہ جگہ بٹی ہوئی تھی۔ ہندوستان کے جرنیلوں کو پاکستان کی ہر چوکی کا مفصل علم تھا۔ لہٰذا وہ بڑے اطمینان سے چوکی سے ذرا ہٹ کر گذر جاتے تھے اور حتی الامکان لڑائی سے گریز کرتے تھے۔ اس طرح ہندوستانی فوج کم سے کم لڑتی ہوئی

آگے بڑھتی گئی۔ جنگ شروع ہونے کے آٹھویں دن وہ ڈھاکہ سے صرف تین میل کے فاصلے پر تھے۔ یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کی جوائنٹ کونسل جو گورنر، مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، چیف سیکرٹری اور گورنر کے فوجی مشیر پر مشتمل تھی سے کہا کہ وہ حالات کے مطابق خود ہی فیصلہ کریں کہ کیا کرنا چاہئے۔ کونسل نے بہتیرا کہا کہ ابھی تک ہمارا آپ کا رابطہ برقرار ہے لہٰذا آپ ہی حالات کے مطابق ہدایت دیں۔ یحییٰ خان نے اصرار کیا کہ کونسل فیصلہ کرے۔ جب کونسل نے صرف مشرقی پاکستان کے محاذ پر جنگ بندی کے لئے سلامتی کونسل کو ایک قرارداد بھجوائی تو یحییٰ خان نے یہ کہہ کر وہ قرارداد منسوخ کروادی کہ کونسل نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے مشرقی اور مغربی دونوں محاذوں پر جنگ بندی کی تجویز دی ہے۔ اس قرارداد کی منسوخی کے تین دن بعد اس نے مشرقی پاکستان کے گورنر اور فوجی کمانڈر کو ہتھیار ڈالنے کی ہدایت کر دی۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح کو ہتھیار ڈال دینے کی ہدایت ملنے کے بعد جب گورنر مشرقی پاکستان نے صدر پاکستان کو ٹیلیفون کیا تو ان کی بات نہ ہو سکی۔ سٹاف افسروں نے کہا کہ صدر بہت مصروف ہے۔ گورنر کے اصرار پر انہوں نے کہا کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ گورنر نے کہا کہ آدھا ملک جا رہا ہے، کیا میں بطور نمائندہ صدر اور گورنر صدر سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ سٹاف افسر نے جواب میں ٹیلیفون بند کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یحییٰ شراب کے نشے میں چور تھا اور بات کرنے کا اہل نہیں تھا۔ ہتھیار ڈالنے کے نتیجے میں لامحالہ مشرقی پاکستان ملک کا حصہ نہ رہا۔ اس طرح ملک توڑنے کے اس ناقابل معافی جرم کو یحییٰ خان اور اس کے ٹولے نے ڈرامائی انداز میں پایہ تکمیل کو پہنچایا لیکن ان کی خواہشات کے برعکس خود ان کی بچہ سقہ والی حکومت بھی ختم ہو گئی۔

مشرقی پاکستان میں اس ذلت آمیز شکست کے بعد پاکستانی فوج لڑکھڑا گئی۔ اس نے اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کیا جو اس وقت مغربی پاکستان میں اکثریت پارٹی کا قائد تھا۔ قوم نے یحییٰ خان پر بڑی لعن طعن کی۔ اچھا ہوا کہ اسے حفاظتی حراست میں رکھ لیا گیا تھا ورنہ لوگ یقیناً اسے بر سرعام پھانسی دینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ اس حفاظتی حراست کے زمانے میں جب وہ ایک پولیس کی کار میں لے جایا جا رہا تھا تو لوگوں نے دیکھ لیا اور بے تحاشا پتھر کار پر مارے۔

ایوب خان کے ۱۹۵۸ء کے اعلان مارشل لاء کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت صحیح معنوں میں منتخب حکومت تھی۔ بطور وزیراعظم بھٹو نے ہندوستان میں مقید نوّے ہزار جنگی قیدیوں کو چھڑوایا، پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ جو مغربی پاکستان میں بھارتی فوج کے قبضے میں تھا، واگذار کرایا اور اس کے عوض میں کچھ نہیں دیا۔ پھر اس نے قوم کی مشکلات کی طرف توجہ دی اور فوج کے کھوئے ہوئے وقار کی بازیابی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مسٹر بھٹو کے دور میں جو اہم کام پایہ تکمیل کو پہنچے ان میں قابل ذکر ہیں ۱۹۷۳ء کا متفقہ آئین، بنیادی صنعتوں کا قومیانہ، بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کا قومیانہ، مشرقی ممالک سے تعلقات

استوار کرنا' اشتراکی ممالک سے تعلقات بڑھانا' مسلم ممالک سے قریبی اور برادرانہ تعلقات قائم کرنا اور پھر ایٹمی پروگرام پر عمل در آمد۔ مغرب اور خصوصاً امریکہ بھٹو کا مخالف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بھٹو کا رجحان بائیں بازو کی طرف زیادہ ہے۔ اب ان کو یہ خدشہ ہوا کہ یہ مسلم ممالک کی مدد سے 'انہیں کی خاطر ایٹم بم بنانے میں مشغول ہے اور اگر بن گیا تو یہ بم اسرائیل کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امریکیوں نے ہر قیمت پر بھٹو کو اقتدار سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور جیسا میں نے پہلے باب میں تفصیل سے کہا ہے کہ انہوں نے نہ صرف بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا بلکہ اس کے ساتھ ہی ملک میں ایک اور مارشل لاء کی راہ ہموار کر دی۔

تیسرا مارشل لاء

مارشل لاء کے نفاذ پر وہی پرانے اقدام یعنی سیاستدانوں کی گرفتاری' کرفیو' گلی بازار فوج کا گشت' پریس پر سنسر شپ وغیرہ بروئے کار لائے گئے۔ بھٹو کی بنائی ہوئی فیڈرل سکیورٹی فورس FEDERAL SECURITY FORCE توڑ دی گئی۔ متعدد سینئر سول افسران بشمول کیبنٹ سیکرٹری' پرائم منسٹر کا سیکرٹری' ڈائریکٹر انٹیلی جنس' ڈائریکٹر جنرل وفاقی ادارہ تحقیق بھی حراست میں لے لئے گئے اور عرصہ دراز تک ان سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ جیسا کہ پچھلے باب میں لکھا جا چکا ہے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی شام کو جنرل ضیاء الحق نے ٹیلی ویژن پر تقریر کرتے ہوئے ملک میں مارشل لاء لگانے کا اعلان کیا اور مفصل بتایا کہ چونکہ پیپلز پارٹی اور پی این اے کے درمیان سمجھوتے کا کوئی امکان نہیں اور چونکہ ملک میں سخت بدامنی ہے' لہٰذا مارشل لاء امن کی بحالی اور انتخابات کے ماحول کو خوشگوار بنانے کے لئے صرف نوے دن کے لئے لگایا گیا ہے۔ خود جنرل ضیاء الحق کو اور نہ ہی فوج کو سول حکومت میں دخل دینے کا شوق ہے اور نہ وہ اس قلیل عرصے کے لئے بھی مارشل لاء لگانے پر خوش ہیں۔ یہ سب کچھ اشد ضرورت کے لئے کیا جا رہا ہے اور بہت ہی عارضی اقدام ہے۔ اس تقریر کا پورا متن انگریزی میں کتاب کے آخر میں دے دیا گیا ہے۔ جو بات دہرائی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ جنرل ضیاء الحق نے قوم سے حلفیہ اقرار کیا کہ اکتوبر کے آخر میں' یعنی ٹھیک تین ماہ کے بعد الیکشن کرائے جائیں گے۔

اولاً یہ بات قطعی درست نہیں کہ پیپلز پارٹی اور پی این اے کے درمیان سمجھوتے کا امکان نہیں تھا۔ طویل مذاکرات کے بعد مکمل سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ جب بلوچستان سے فوج ہٹانے کے پروگرام کے متعلق پی این اے نے مفصل رپورٹ مانگی تو خود جنرل ضیاء الحق نے مذاکرات کمیٹی کے کمرے میں بنفس نفیس رپورٹ دی۔ تمام متنازعہ نکات پر بحث کے بعد متفقہ فیصلے ہو چکے تھے۔ الیکشن کا پروگرام طے ہو گیا تھا اور معاہدے کی دستاویز پر دستخط ہونے باقی رہ گئے تھے۔ پی این اے کی تحریک پر جو ہنگامے ہو رہے تھے وہ تو

مذاکرات کے شروع ہوتے ہی بند ہو گئے تھے۔ زندگی معمول پر آچکی تھی۔ لہٰذا حالات کی اس قدر بہتر صورت میں مارشل لاء لگانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ نوّے دن کے بعد الیکشن کا جو وعدہ مارشل لاء کے اعلان کے ساتھ ہوا تھا اندرون اور بیرون ملک ایک مذاق بن کر رہ گیا۔

یونانی تاریخ دان گروٹے GROTE نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے۔

"اقتدار کے غاصب اکثر لوگوں سے غلط بیانی کر کے ان کو عارضی جنگ بندی پر راضی کر لیتے ہیں، پھر طاقت کے استعمال کا دور آتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنا اختیار جبری طور طریقوں سے مستحکم کر لیتے ہیں۔"

لہٰذا جو کچھ پاکستان کی مختصر تاریخ میں ہوتا رہا ہے وہ کوئی نیا تجربہ نہیں۔ بنی نوع انسان ایسی بلکہ بدتر مشکلات کا سامنا کر چکا ہے۔

آئین معطل کر دیا گیا۔ مارشل لاء آرڈر اور ریگولیشن برسنے لگے۔ کڑی سزاؤں کا اعلان کر دیا گیا۔ اسلام کے نام پر عبرتناک سزائیں تجویز ہوئیں۔ شروع شروع میں لوگوں کو بر سرعام کوڑے مارے گئے۔ کوڑے مارے جانے کی تقریب ایک اچھے خاصے جشن کی صورت اختیار کر گئی۔ لوگوں کو دعوت دی جاتی، آنے والوں کے لئے کرسیاں اور ٹھنڈے مشروب مہیا کئے جاتے۔ ملزم یا مجرم کو ایک ٹکٹکی پر باندھ دیا جاتا، اس کے منہ کے پاس مائیکروفون لگایا جاتا اور لاؤڈ سپیکر تماشائیوں کے رخ کر دیئے جاتے۔ مجرم کی ننگی پیٹھ پر جب کوڑا لگتا تو اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکلتی جو لاؤڈ سپیکر پر دوچند ہو کر ایک دلدوز گونج کے ساتھ پھیلتی۔ چنانچہ اس آب و تاب سے مارشل لاء کا آغاز ہوا جو نوّے دن میں ملک میں امن برقرار کرنے اور الیکشن کرانے کے لئے لگایا گیا تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ مملکت خداداد پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہونا چاہئے۔ سو نوّے دن کے قلیل عرصے میں ظاہر ہے اور زیادہ تو ہو نہیں سکتا تھا کوڑے مارنا اور سنگساری ہی کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ کوڑے مارنے کا عوامی تماشا بڑے طمطراق سے ہوتا رہا اور ہمارے مارشل حکام اسلام کی خدمت کرتے رہے۔ ایک کوئی دل جلا منہ پھٹ مجرم کوڑے کھا کر "ہائے" کہنے کی بجائے حکام کی شان میں گستاخی کے کلمات بکنے لگا اور بعض کی ولدیت پر شک کا اظہار۔ اس کے بعد لاؤڈ سپیکر والا سلسلہ بند ہو گیا۔

بیشتر سیاسی لیڈروں کو تین ہفتے کے بعد حراست سے رہا کر دیا گیا۔ لیکن سرکاری افسروں میں سے بہت سے کافی عرصے کے لئے محبوس رہے اور ان سے پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ بعض نے باہر آ کر تشدد کی شکایت بھی کی۔ جو اطلاعات اس تفتیش سے ملیں وہ قرطاس ابیض WHITE PAPER میں شامل کی گئیں۔ ان میں سے جن اصحاب نے تعاون کیا ان کو جلد رہا کر دیا گیا۔ بعض لمبے عرصے کے لئے روک لئے گئے حامد جلال جو وزیر اعظم کے سیکرٹریٹ میں انفارمیشن کے محکمے میں کام کرتا تھا، دل کا مریض تھا۔

بیچارہ حراست ہی میں دم توڑ گیا۔ اس کے برعکس راؤ رشید جو سخت جان تھا اور جس نے تعاون کرنے سے انکار کیا مارشل لاء کے طویل عرصے میں اکثر اوقات ہی جیلوں میں رہا۔ ذلت آمیز، کڑی اور حد سے بڑھی ہوئی سزائیں دینے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ عوام کو خوفزدہ رکھا جائے اور کوئی حکومت کے خلاف آواز اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ ایمینسٹی انٹرنیشنل AMNESTY INTERNATIONAL کی رپورٹ کے مطابق ہزارہا لوگ جیلوں میں ٹھونسے ہوئے تھے صرف اس لئے کہ انہوں نے مارشل لاء حکّام کی پالیسیوں کے خلاف رائے کا اظہار کیا۔ ایک دفعہ ایک غیر ملکی پریس رپورٹر نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے پوچھ لیا کہ آپ کے ہاں کتنے سیاسی قیدی ہیں۔ موصوف نے فرمایا' چند ہزار جنہیں تم اپنی انگلیوں پر گن سکتے ہو۔ یہ الفاظ یعنی "چند ہزار" ہو سکتا ہے کہ غلطی سے زبان سے ادا ہو گئے ہوں لیکن حقیقت سے کچھ دور نہیں تھے۔

رانا شوکت محمود پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں پنجاب میں وزیر تھے۔ کیونکہ انہوں نے تعاون نہ کیا یعنی بھٹو کے خلاف کچھ نہ کہا' وہ پانچ سال یا کچھ زائد جیل میں رہا جہاں ان کو شدید دل کا دورہ پڑا لیکن پھر بھی رہائی نہ ہوئی۔ بد دیانتی کے الزام میں ان کے خلاف ایک عرصہ تک تفتیش ہوتی رہی۔ آخر کار صرف یہ ثابت ہو سکا کہ وزیر صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری نے ایک ذاتی کام کے لئے سرکاری کار استعمال کر لی تھی۔ اس تفتیشی معرکے کے بعد بھی رانا شوکت کی گلوخلاصی نہ ہوئی۔ صرف یہی نہیں رانا شوکت محمود کی اہلیہ جو ایک ڈاکٹر ہیں' ان کو پورے چھ ماہ لاہور قلعے کے تہہ خانے میں بند رکھا گیا اور پورا عرصہ اس نیک خاتون نے سورج کی کرن نہیں دیکھی۔ یہ وہ تہہ خانے ہیں جہاں بڑے بڑے ڈاکو بند کئے جاتے تھے اور وہ دہشت سے اپنے جرم قبول کر لیتے تھے۔ حال ہی میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے ان تہہ خانوں میں ملزمان کو رکھنے کا سلسلہ اس وجہ سے بند کرا دیا ہے کہ یہ ایک غیر انسانی سلوک ہے۔

فوجی عدالتوں میں سنگین مقدمات کی کارروائی بھی کچھ ایسی قابل تحسین نہیں رہی۔ پانچ ملزمان جن پر ۱۹۸۱ء میں پی آئی اے P I A کا طیارہ اغوا کرنے کا الزام تھا بند کمرے میں فوجی عدالت میں پیش ہوئے۔ عدالت نے طویل سماعت اور غور و خوض کے بعد ۱۱ اگست ۱۹۸۱ء کو ایک ملزم کو پھانسی اور باقی چار کو دیگر مختلف سزائیں دیں۔ یہ حکم مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے پاس پیش ہوا اور ۱۹ اگست ۱۹۸۱ء کو اس کی توثیق کر دی گئی پھر نامعلوم وجوہات کی بنا پر اسی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے توثیق کا یہ حکم منسوخ کر دیا اور پانچ افسروں پر مشتمل اسی فوجی عدالت کو دوبارہ سماعت کا حکم جاری کیا جس میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ ان سب ملزمان کو سزائے موت ملنی چاہئے۔ چنانچہ سزائے موت کا فیصلہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے توثیق کیا گیا اور اس پر عمل در آمد ہوا۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس مقدمہ کے گواہان سب پولیس والے ہی تھے۔

۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو جب مارشل لاء نافذ کیا گیا تو دوسرے لیڈر اصحاب کے ساتھ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو بھی حراست میں لے لیا گیا اور اُسی ماہ کے آخر میں دوسروں کے ہمراہ انہیں بھی رہا کر دیا گیا۔ وزیر اعظم کی معزولی سے عوام میں ان کی مقبولیت کم نہ ہوئی۔ چنانچہ جب اس نے کراچی سے لاہور بذریعہ ریل سفر کا تہیہ کیا تو مارشل لاء حکام کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ ہر سٹیشن پر جہاں یہ ریل گاڑی رکے گی لوگ جوق در جوق بھٹو کو دیکھنے اور اس کی تقریر سننے کے لئے آئیں گے اور اس طرح دوبارہ ایک جوابی تحریک شروع ہو جائے گی۔ بھٹو کی شخصیت کی کشش اور اس کی جادو بیانی سے لوگ گلیوں میں نکل آئیں گے اور پی این اے کے جلسے جلوسوں سے کہیں بڑھ کر عوام کے جم غفیر سنبھالنے مشکل ہو جائیں گے۔ یہ صورت حال حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اس ڈر سے بھٹو کو ریل کے سفر سے منع کر دیا گیا اور صرف ہوائی جہاز سے سفر کی اجازت دی گئی۔ ۸ اگست ۱۹۷۷ء کو یعنی مارشل لاء لگنے کے ایک ماہ تین دن بعد جب بھٹو لاہور کے ہوائی اڈے پر اترے تو ایک بہت بڑا مجمع ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ انہوں نے بھٹو صاحب جمہوریت کے حق میں نعرے لگائے۔ بھٹو نے اس مجمع کے سامنے کوئی تقریر نہ کی بلکہ صرف یہی ہدایت کی کہ پر امن طریقے سے منتشر ہو جائیں اور اچھے دنوں کا انتظار کریں۔ عوام منتشر ہو گئے، لیکن ان میں سے ایک گروہ کا واپس جاتے ہوئے اتفاقاً پی این اے کے لیڈروں سے آمنا سامنا ہو گیا۔ یہ لیڈر صاحبان اسی وقت اپنی ایک میٹنگ سے اٹھ کر آ رہے تھے۔ عوام ان کو دیکھ کر مشتعل ہو گئے، دو ایک سے بد سلوکی کی اور ان کو ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کا مورد الزام ٹھہرایا۔ مارشل لاء ٹولے کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ ملک میں کون کس پانی میں ہے۔ مارشل لاء حکام میں یہ تجویز بھی زیر غور رہی کہ بھٹو سے سمجھوتہ کر لیا جائے، لیکن اس پر عملدرآمد نہ ہو سکا۔

دریں اثناء تین جرنیلوں پر مشتمل ایک کمیٹی یا سیل (CELL) مقرر ہوا لیفٹیننٹ جنرل فیض علی چشتی اس کے سربراہ اور میجر جنرل راؤ فرمان علی اور احسان الحق ممبران تھے یہ سیل ویسے تو الیکشن سیل کہلاتا تھا لیکن اصل مدعا اس کا بھٹو کے خلاف مواد جمع کرنا تھا جس کی مدد سے عوام میں اس کا تاثر (IMAGE) برباد ہو۔ لیکن باوجود مسلسل کاوش کے انہیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس الیکشن سیل نے تین بار مجھے بھی بلایا پہلے دو دن تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور میں اپنی موٹی عقل کی وجہ سے ان بے معنی ملاقاتوں کا مطلب نہ سمجھ پایا۔ تیسرے دن ایک جنرل نے چپکے سے مجھے کہا کہ بھٹو صاحب کیخلاف کچھ بتاؤ تب میری آنکھیں کھلیں تین برس مجھے وزیر اعظم کے نزدیک رہ کر کام کرنا پڑا تھا۔ حسن اتفاق سے ان تین سالوں میں بھٹو صاحب نے مجھے نہ تو کبھی کوئی غلط کام کرنے کو کہا نہ کوئی جھوٹا مقدمہ بنانے کو اور نہ ہی کسی زیر تفتیش مقدمے کو کوئی خاص رخ دینے کی ہدایت کی۔ ڈائریکٹر جنرل وفاقی ادارہ تفتیش (F.I.A.) تعینات ہونے کے فوراً بعد مجھے دو اہم انکوائریاں دی گئیں ایک ایئر مارشل اصغر خاں کے خلاف اور دوسری

خورشید حسن میر کے خلاف۔ قارئین کو یاد ہو گا کہ وزیراعظم نے اسمبلی میں کہا تھا کہ میں ان دونوں کی انکوائری کرواؤں گا اور سپریم کورٹ بقیہ کارروائی کرے گی۔ میں نے بڑی ذمہ داری سے ہر پہلو پر دریافت کی۔ دونوں حضرات کے خلاف کوئی خاص انکشاف نہ ہوا۔ چنانچہ میں نے دونوں پر ایک منفی رپورٹ دیدی۔ وزیراعظم کے پاس جانے سے پہلے یہ رپورٹ سکیورٹی افسر جو ایک تجربہ کار پولیس افسر تھا' نے دیکھی اور مجھے بلا کر سمجھانے کی کوشش کی یہ رپورٹ وزیراعظم کو ہرگز پسند نہیں آئیگی کیونکہ اس نے اسمبلی میں ان دونوں حضرات اصغر خان اور خورشید حسن میر کے خلاف بیان دے رکھا ہے اب وہ اسمبلی میں کیسے کہے گا کہ یہ دونوں تو بے گناہ اور مجھے ہی غلطی لگی تھی۔ میں نے بتایا یہ رپورٹ بڑی کاوش کی دریافت کے بعد تیار ہوئی ہے۔ سکیورٹی افسر نے اشارتاً کہا کہ کچھ تو اس میں ڈالو جس سے کم از کم وزیراعظم کی ناراضگی سے بچ سکو۔ میں نے عرض کیا کہ میں کسی سیاسی مقصد کیلئے کوئی غلط رپورٹ لکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ سکیورٹی افسر نے مایوسی سے کہا پھر تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔ بلکہ ان کے ایک ماتحت افسر نے کہا کہ بہتر ہے اپنا بستر بھی باندھ رکھو۔ میں نے عرض کیا کہ بندھا ہوا ہی ہے۔ میری رپورٹ وزیراعظم کے پاس گئی۔ دو ہفتے بعد مجھے بلایا گیا۔ میں پیش ہوا۔ وزیراعظم بھٹو کے جلال سے چھوٹے بڑے افسران سب واقف اور خائف تھے۔ سیکرٹریوں کو بھری محفل میں ڈانٹ دینا معمولی بات تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بھٹو نے کہا کہ میں نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ میں تمہارے کام کو بغور دیکھتا رہا ہوں اور خوش ہوں کہ تم محتاط انداز سے کام کرتے ہو اور محنت کرتے ہو۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہیں میری مکمل حمایت SUPPORT ملتی رہے گی۔ میں یہ الفاظ سن کر خوش بھی ہوا اور حیران بھی اور سوچا کہ شاید تمہید ہے' حاصل غزل مصرع اس کے بعد وارد ہو گا۔ لیکن یہی حرف آخر تھا۔ چنانچہ میں نے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور اجازت لے کر واپس آ گیا۔ یہ قصہ میں نے الیکشن سیل کے جرنیل صاحبان کو سنایا۔ صاف نظر آ رہا تھا ان کو اس میں نہ تو لطیفے کا پہلو نظر آیا اور نہ ہی مجھ سے تعاون کی کوئی توقع۔ لہٰذا میرا انٹرویو اسی بات کے بعد ختم ہو گیا۔

جس دوران الیکشن سیل راولپنڈی کور ہیڈ کوارٹر میں اپنی تفتیش کر رہا تھا کسی اور نامعلوم جگہ پر سابق ڈائریکٹر جنرل وفاقی سکیورٹی فورس (F.S.F.) کے ساتھ یہی عمل فوج کی ایک ٹیم خفیہ طور پر کرنے میں مشغول تھی۔ مسعود محمود ایک نہایت ذہین اور قابل افسر تھا لیکن تھا انتہائی خود پسند' اکڑباز اور بے ضمیر۔ اس کے سر میں سودا یہ سمایا ہوا تھا کہ وہ کم از کم کسی صوبے کا گورنر بنایا جانا چاہئے۔ یہ بات اس نے خود مجھے اشارتاً کہی۔ اسے یہ بھی شوق تھا کہ وہ سب خاص و عام کے لئے مرکز توجہ رہے۔ حکام نے جو اس سے پوچھ گچھ کر رہے تھے اسے یقین دلایا کہ بھٹو کے دن پورے ہو چکے تھے اور اس کا دوبارہ اقتدار میں آنا ناممکن تھا۔ چنانچہ نواب محمد احمد کے قتل کے کیس میں مسعود محمود وعدہ معاف گواہ بن گیا۔ مبینہ طور پر وزیراعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو کی ایما پر مسعود محمود نے اپنے ماتحت عملے سے یہ قتل کروایا تھا۔ بھٹو کو اس مقدمہ

میں گرفتار کرا لیا گیا۔ لاہور ہائیکورٹ میں اس بنا پر کہ مقدمہ کے قرائن سے جرم کا ثابت ہونا بہت مشکوک تھا بھٹو کی ضمانت ہو گئی۔

جب بلاوجہ، غیر متعین عرصہ کیلئے انتخابات ملتوی ہو گئے تو میں نے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر سے اجازت لی اور حج کیلئے روانہ ہو گیا۔ مدینہ منورہ میں کرنل حسن جو اٹارنی جنرل کے ایڈیشنل سیکرٹری تھے مجھے آ ملے۔ حسن نے مجھے بتایا کہ بھٹو کے کیس کا تفتیشی افسر تفتیش کی فائل مکمل کر کے اٹارنی جنرل کے پاس لایا تاکہ ان کی رائے لی جائے۔ اٹارنی جنرل نے حسن کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ فائل کا مطالعہ کر کے رائے دے۔ حسن نے فائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد رائے دی کہ اس کیس میں کوئی جان نہیں ہے اور یہ عدالت میں پیش کرنے کے قابل نہیں۔ تفتیشی افسر یہ سن کر بہت ناراض ہوا۔ بات اٹارنی جنرل تک پہنچی جس نے کہہ دیا کہ اگر کرنل حسن کی رائے معتبر نہیں تو کسی اور ماہر قانون سے رائے لے لی جائے۔ چنانچہ اس طرح ایم۔ انور۔ بیرسٹر اس کیس میں شامل ہوئے۔ انور کو ایک بار بھٹو نے کسی سیاسی احتجاج کی بنا پر جیل بھجوا دیا تھا۔ جیل کی صعوبت برداشت نہ کر سکنے پر انور نے تحریری معافی مانگ کر رہائی حاصل کی۔ لیکن اس بات کا رنج اس کے دل میں رہا۔ بیرسٹر انور نے تفتیش کے نقش نگار سنوارے، نوک پلک درست کی، کچھ ڈالا کچھ نکالا اور کیس سیشن جج کی عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

مولوی مشتاق حسین چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ، بھٹو صاحب سے ناراض تھے۔ کیونکہ بھٹو صاحب نے مولوی مشتاق حسین کو کسی وجہ سے اپنے دور میں چیف جسٹس نہ بنایا اور یہ عہدہ مولوی صاحب کو عہدہ ان کو مارشل لاء کے عہد میں ملا۔ ———— انصاف کا تقاضا تھا کہ ان حالات میں مولوی صاحب بھٹو کے خلاف مقدمے کی سماعت نہ کرتے لیکن انہوں نے سیشن کورٹ سے یہ مقدمہ اپنی عدالت میں منتقل کیا اور اس کی سماعت کی۔ سماعت کے دوران تفتیش میں بہت سا ہیر پھیر کیا گیا۔ آخر بھٹو کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ سپریم کورٹ میں اپیل پر چار جج صاحبان سزا کے حق میں اور تین بریت کے حق میں تھے، اس لئے سزا بحال رکھی گئی۔ فیصلے میں لکھا گیا کہ سزا تو قانوناً بحال رکھی جاتی ہے لیکن اگر حکومت چاہے تو اسے معافی میں بدل سکتی ہے۔

بھٹو کیس میں سزا کی بنیاد ایک وعدہ معاف گواہ کی شہادت تھی سپریم کورٹ میں اپیل خارج ہونے پر حکومت بڑی عجلت میں تھی کہ پھانسی پر عمل درآمد ہو لیکن ان کو رکنا پڑا کیونکہ قواعد کے مطابق ریویو کے لئے پندرہ دن کا وقفہ دینا لازمی ہے۔ جب کبھی اپیل کے فیصلے میں جج صاحبان کی رائے میں تضاد ہو یعنی ایک جج بھی سزا کے فیصلے سے اتفاق نہ کرے تو پھانسی نہیں دی جاتی بلکہ سزا عمر قید میں تبدیل کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح اگر سیاسی یا سماجی دباؤ کا اندیشہ ہو تو بھی یہی کیا جاتا ہے۔ یہ تمام قواعد نظر انداز کر دیئے

گئے۔ بیسیوں دوست ممالک سے بھٹو کی جان بخشی کی اپیلیں آئیں اور کہا گیا اس نوجوان سیاستدان کو جو دنیا بھر میں نام پیدا کر چکا ہے زندہ رہنے دیا جائے۔ لیکن مارشل لاء کے حکام نے ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو بھٹو کو راولپنڈی جیل میں پھانسی دی اور رات کے اندھیرے میں اس کی نعش کو اس کے آبائی قبرستان میں دفنا دیا۔ کسی ایک آدھ قریبی رشتہ دار کو ایک پل کے لئے میت دکھائی گئی۔ بقیہ خاندان کو رسومات ادا کرنے کی اجازت تک نہ ملی۔ خوف یہ تھا ایسا کرنا کہیں تحریک اور ہنگاموں کا باعث نہ بن جائے۔

مارشل لاء حکام کو آخر کیا مجبوری تھی کہ کمزور شہادت کے باوجود بھٹو پر قتل کا مقدمہ چلائے اور پھر نہایت قریبی دوست ممالک مثلاً سعودی عرب' امارات متحدہ' لیبیا اور دیگر بہت سے ممالک کی پرزور اپیلوں کے باوجود اسے پھانسی لگائے؟ طارق علی نے اپنی کتاب "کیا پاکستان زندہ رہ سکتا ہے" CAN PAKISTAN SURVIVE میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔

"یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ فوجی آمریت اور سیاسی استحکام' خواہ کتنا ہی عارضی کیوں نہ ہوتا' کے درمیان ذوالفقار علی بھٹو کی ذات سدراہ تھی۔ ڈر صرف اتنا نہیں تھا کہ بھٹو الیکشن میں جیت جائے گا۔ فوج کے کور کمانڈروں کو خوف تو اس بات کا تھا اگر بھٹو زندہ رہتا ہے تو وہ ہمیشہ فوجی حکومت کا ایک متبادل بن کر ان کے سروں پر منڈلاتا رہے گا۔ جیسے ہی شہروں یا دیہات میں کوئی تحریک شروع ہوتی عوام نے لامحالہ اسی عوامی لیڈر سے قیادت طلب کرنی تھی۔ اگر فوج اور عوام میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی اور عوام میں بھٹو پیپلز پارٹی کا پرچم لے کر نکلتا تو اس ٹکراؤ میں عوام کی جیت یقینی تھی"۔

نیویارک ٹائمز ۹ جولائی ۱۹۷۷ء میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق جنرل ضیاءالحق نے ۵ جولائی کے اعلان مارشل لاء کو دہراتے ہوئے جمعہ کی نماز میں پی این اے کی تنقید کے جواب میں کہا۔

"ہم نے مسٹر بھٹو کو اقتدار کے آسمان سے زمین پر گرا دیا ہے۔ آپ لوگ جذباتی نہ ہوں۔ پیشتر اس کے کہ بھٹو کے لئے کوئی سزا تجویز کریں اپنے دلوں کو ٹٹولیں کہ انہی حالات میں آپ اپنے لئے ایسی سزا پسند کریں گے"۔

جنرل ضیاءالحق نے مزید کہا کہ مارشل لاء ایک بہت ہی عارضی اقدام ہے اور نوّے دن کے اس عبوری عرصے کے بعد عنان حکومت منتخب نمائندوں کو سونپ دی جائیں گی۔ پھر زور دے کر کہا

"میں زندگی بھر کبھی کوئی سیاسی عہدہ قبول نہیں کرونگا"۔

یہ خبر مارشل لاء کے اعلان کے چار ہی دن بعد کی ہے۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۷۷ء تک جب کہ مارشل لاء حکام کی گرفت ملک کی انتظامیہ پر مضبوط ہو چکی تھی جنرل ضیاءالحق نے اسی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ

اپنی سیاسی ذمہ داریوں سے دستبردار ہونے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں۔

"میں اس ملک کو چلا رہا ہوں اور یہ ایسے ہی چلے گا جیسے میں چاہونگا"۔

لندن کے اخبار گارڈین کے تبصرہ نگار سائمن ونچسٹر SYMUN WINCHESTER نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں تہران سے لکھا کہ جنرل ضیاءالحق ایک مختصر دورے پر تہران آئے۔ ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اپنے لئے سیاسی اقتدار کے خواہاں ہیں انہوں نے کہا۔

"مجھے کون روک سکتا ہے۔ فوج میرے ساتھ ہے اور میرے پاس طاقت ہے کہ میں جو چاہوں کروں۔ آئین کیا چیز ہے۔ دس بارہ صفحوں کی ایک کتاب۔ اگر میں اس کو پھاڑ کر پھینک دوں اور کہوں کل سے ہم کسی اور نظام کے تحت رہیں گے تو کون ہے جو مجھے روک سکتا ہے؟"۔

سو جیسے جیسے مارشل لاء کی حکومت مضبوط ہوتی گئی، جرنیلوں کے اصل منصوبے ظاہر ہونے لگے۔ وہ کیا عوامل تھے جن کے زیر اثر جنرل ضیاءالحق نے کہا کہ ان کی حکومت جب تک چاہے رہے گی اور قوم جو کرنا چاہتی ہے کر کے دیکھ لے۔ عقل اس بات کو نہیں مانتی کہ جنرل ضیاءالحق اور ان کے رفیق جرنیلوں نے یہ جانتے ہوئے کہ آرٹیکل ۶ آئین پاکستان کے تحت حکومت کا تختہ الٹنا جرم بغاوت ہے جس کی بہت کڑی سزا ہے، مارشل لاء اس لئے تو لگایا تھا کہ وہ صرف نوّے دن حکومت کریں گے۔ اگر شروع میں ایسا ارادہ تھا بھی تو جب عوام کی طرف سے مزاحمت نہ ہوئی یا مزاحمت کے تمام راستے بند کر دیئے گئے تو یقیناً انہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ اقتدار میں رہیں اور جب تک رہ سکتے ہیں رہیں۔ لہٰذا پہلے پہل جو اعلانات نوّے دن میں الیکشن کرانے کے لئے کئے گئے تھے وہ عوام کا ردِّ عمل دیکھنے کے لئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ نو جماعتیں جو پی این اے میں شامل تھیں (جن کو نو ستارے کہا جاتا تھا) باوجود اپنی طویل تحریک اور ہنگاموں کے اب بھی پیپلز پارٹی کے ہم پلہ نہ تھیں اور الیکشن ہوتا بھی تو پیپلز پارٹی ہی کی جیت ہوتی۔ لہٰذا پی این اے جو اب مارشل لاء حکومت کی ممد و معاون تھی خود بھی الیکشن نہیں چاہتی تھی۔ پی این اے کی تحریک برائے الیکشن کی حقیقت اس بات سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ تحریک دراصل صرف اور صرف بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے اور ذاتی طور پر بھٹو کو اقتدار کی کرسی سے ہٹانے کے لئے چلائی گئی تھی۔ عوام جو گلیوں میں نکلے اور جنھوں نے ان لیڈروں کے پیچھے لگ کر اتنی جانی قربانی دی بے نیل و مرام دبک کر گھروں میں بیٹھ گئے کہ الیکشن نہ تو پی این اے چاہتی تھی نہ ہی مارشل لاء حکام۔ اس پر طرہ یہ کہ مارشل لاء جو صرف الیکشن کرانے کے لئے لگایا گیا تھا، پینترا بدل کر ایک بے میعاد حکومت قائم کر کے بیٹھ گیا اور ذرا ذرا سی چوک پر کوڑے، قید و بند کا سلسلہ شروع کر دیا۔ گویا کہ صحیح معنوں میں یہ ایک پھندا تھا جو عوام نے اپنے لیڈروں کی مدد سے ایک مدت مدید تک کے لئے اپنے گلے میں ڈال لیا۔

۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ء کو چوہدری فضل الٰہی صاحب کی صدارت کی میعاد پوری ہوئی اور وہ ریٹائر ہو گئے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، کمانڈر انچیف پاکستان آرمی جنرل ضیاء الحق نے عارضی طور پر یہ عہدہ بھی قبول کر لیا اور اعلان کیا کہ جیسے ہی کوئی مناسب نعم البدل ملتا ہے وہ اس عہدے سے دستبردار ہو جائیں گے۔ اس ملک میں قحط الرجال کا یہ عالم ہے کہ دس سال ہونے کو آئے ابھی تک ایک انسان دس کروڑ کی آبادی میں ایسا سامنے نہیں آیا جو جنرل صاحب کا یہ بوجھ ہی ہلکا کر دیتا۔

عوام میں بے چینی بڑھی تو نومبر ۱۹۷۹ء میں الیکشن کرانے کا اعلان کر دیا گیا۔ البتہ بہت سی پابندیاں لگا دی گئیں۔ پیپلز پارٹی کے بیشتر لیڈر لمبے عرصے کے لئے الیکشن میں حصہ لینے کے نا اہل قرار دے دیئے گئے۔ الیکشن کمشنر کو اختیار دیا گیا کہ اگر کوئی پارٹی نظریہ پاکستان پر یقین نہ رکھتی ہو یا پاکستان کی سالمیت پر حرف لاتی ہو تو اسے الیکشن میں بطور پارٹی حصہ لینے کی نا اہل قرار دے سکے۔ یہ ایک ایسی شرط تھی جو عائد کرنا آسان تھی۔ جس پارٹی سے حکومت کو مخاصمت ہوا سے نا اہل قرار دینا تو بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جداگانہ رائے دہی طریق انتخاب میں شامل کر دی گئی۔ غرض ہر طریقے سے الیکشن کے نظام کو پیچیدہ بنا دیا گیا اور کوشش یہی کی گئی کہ پیپلز پارٹی جیت نہ سکے۔ ذرائع ابلاغ پر پابندی اور کڑی کر دی گئی اور ان پر واضح کر دیا گیا کہ مارشل لاء کی حمایت ہی سے انہیں سہولتیں میسر آسکیں گی۔ الیکشن کے امیدواروں پر پابندی لگ گئی کہ حکومت کی شان میں گستاخی کا کوئی کلمہ نہ کہیں۔

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے کہنا شروع کیا کہ صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں بہت تفاوت اور ان میں تناسب ضروری ہے لہٰذا آئین میں متعلقہ شقوں کی ترمیم ہونی چاہیئے۔ مسلح افواج کا آئین میں فعال کردار ہونا چاہیئے۔ متناسب نمائندگی کے نظام کے تحت الیکشن ہونا چاہیئے۔ متناسب نمائندگی کا نظام یقیناً مؤثر طور پر پیپلز پارٹی کی شکست کا ضامن ہو سکتا تھا۔ ملک میں سیاست کی بنیادوں کی کمزوری اور سیاسی پارٹیوں میں اختلافات کی وجہ سے فوج کو ثالث اعلیٰ کا درجہ دینا مقصود تھا۔ براہ راست الیکشن جو ہمیشہ سے ملک میں پسندیدہ نظام رہا ہے محض اس لئے منظور نہ تھا کہ اس سے پیپلز پارٹی کے اقتدار میں آجانے کا خطرہ تھا جو حکومت کسی صورت میں نہیں لینا چاہتی تھی۔ لہٰذا اوپر بیان کئے ہوئے تمام حربے بشمول فوج کو سیاسی عمل میں ملوث کرنے کے اختیار کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ متناسب نمائندگی کے نظام کی تعریف کرتے ہوئے صاحب صدر نے یہ بھی کہا کہ الیکشن ہو جائے تو میں فوج سے بھی ریٹائر ہو کر الگ ہو جاؤں گا۔ اس بار ملک میں کسی نے بھی صدر کے اس اعلان یا الیکشن کے پروگرام پر یقین نہ کیا اور ہوا بھی وہی کہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء یعنی الیکشن کی تاریخ سے ایک ماہ قبل الیکشن غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی ہو گئے۔ تمام سیاسی پارٹیاں اور سیاسی عمل خلاف قانون قرار دیئے گئے۔ ہڑتال کرنا غیر قانونی ہو گیا۔ چند اخبار و رسائل جن سے تنقید کا خطرہ تھا بند کر دیئے گئے۔ بقیہ اخبارات وغیرہ پر کڑی سنسر شپ عائد ہو گئی۔ صدر نے اعلان

کر دیا کہ اب مارشل لاء اور بھی سخت گیر ہو گا اور فوجی عدالتوں کے فیصلوں پر کوئی اعلیٰ عدالت نظرثانی نہیں کر سکے گی اور اس طرح ملک پر مارشل لاء مسلّط رہا۔

تحریک برائے بحالی جمہوریت MOVEMENT FOR RESTORATION OF DEMOCRACY

یا ایم آر ڈی نے آہستہ آہستہ رائے عامہ ہموار کرنی شروع کی اور بحالیٔ جمہوریت کیلئے دباؤ بڑھنے لگا۔ خصوصاً سندھ میں امن عامہ انتظامیہ کی گرفت سے باہر ہو گیا' فوج بلائی گئی اور بہت سے لوگ مارے گئے تو جنرل ضیاء الحق نے ۱۴ اگست ۱۹۸۳ء کو اعلان کیا کہ الیکشن ایک سال تک اور زیادہ سے زیادہ مارچ ۱۹۸۵ء میں کرائے جائیں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ فوج کا کوئی آئینی کردار نہیں ہو گا۔ الیکشن جماعتوں کی بنیاد پر ہوں گے یا غیر جماعتی اس کا فیصلہ الیکشن سے قبل کیا جائے گا۔ امیدواروں کے لئے ستھرا کردار' خدا ترسی اور نیکی کا شعار لازم قرار دیا گیا۔ ضیاء الحق نے کہا کہ ذاتی طور پر وہ صدارتی نظام کے حامی ہیں۔ آخر میں یہ بھی کہا کہ وہ خود کسی سیاسی عہدے کے امیدوار نہیں ہوں گے۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اسلام میں یہ درست نہیں کہ کوئی شخص خود کو کسی عہدے کا امیدوار ٹھہرائے۔ ایک اخبار نویس کے استفسار پر کہ ان کا اپنا حلقہ نیابت کون سا ہے، جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ ملک میں پینتیس ہزار زکوٰۃ کمیٹیاں ان کا حلقہ نیابت ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے فوج ہی کو اپنا حلقہ نیابت کہا تھا۔

یہ ذکر کرنا دلچسپی کا باعث ہو گا کہ پہلے چار سال میں زکوٰۃ کمیٹیوں نے تین ارب تیس کروڑ روپیہ جمع کیا اور لوگوں میں تقسیم کیا۔ زکوٰۃ کمیٹیوں کو اس تقسیم کا حساب کتاب رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں لہٰذا اس کثیر ٹیکس کو جمع کرنا اور بغیر حساب تقسیم کا اختیار کمیٹیوں کے لئے نہایت خوش آئندہ فریضہ ہے اور ان میں سے بیشتر اس نظام کا دوام چاہتی ہیں۔ لیکن الیکشن کے عمومی طریق کار کے مطابق ملک بھر میں پھیلی ہوئی زکوٰۃ کمیٹیاں تو کوئی حلقہ نیابت نہیں بن سکتیں۔ لہٰذا صدر صاحب کا یہ کہنا کہ زکوٰۃ کمیٹیاں ان کی حلقہ نیابت ہیں محض اپنے اس رفاہی کام کی مقبولیت کی دلیل تھی' گو کہ ریفرنڈم ۱۹۸۴ء کی اصل داستان نے ثابت کر دکھایا کہ یہ دعویٰ بھی بے بنیاد تھا۔ بہرطور جنرل ضیاء الحق نے اس سٹیج پر یہ کہا کہ اگر قومی اسمبلی یا مجلس شوریٰ انہیں درخواست کرے تو وہ ملک اور قوم کی خدمت کے لئے صدارت کا عہدہ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ طریق کار ہر لحاظ سے مناسب اور سہل تھا' نہ کوئی حلقہ نیابت' نہ الیکشن اور ووٹ کا جھگڑا' نہ کسی سے مقابلہ۔ بقیہ مارشل لاء حکام کو بھی ایسے انتظام سے اطمینان تھا کہ ضیاء الحق صاحب کے ہوتے ہوئے ان کا نہ تو احتساب ہو سکتا تھا اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی باز پرس۔ چنانچہ اس طریق کار کو یقینی بنانے کے لئے یہ اضافی اعلان بھی کر دیا گیا کہ الیکشن کے بعد چھ ماہ تک مارشل لاء بدستور جاری رہے گا۔ مقصد ظاہر ہے یہی تھا کہ اسمبلیاں مارشل لاء کے زیر سایہ صدر صاحب کا چناؤ کر لیں اور پھر یہ سایہ عاطفت قوم کے سروں سے ہٹا یا جائے۔

مارشل لاء کے جواز کا اعتراف

ایوب خان نے مارشل لاء لگانے کا یہ جواز پیش کیا تھا۔

"کمزور اور ڈھلمل یقین سیاسی حکومتوں نے قوم میں سے نظم و ضبط مٹا دیا' سیاستدان ہمہ وقت آپس کے جھگڑوں میں مصروف رہے اور انہوں نے اپنی ہوس اقتدار کی خاطر قوم اور ملک کے مفادات کو پس پشت ڈال دیا"۔

یحییٰ خان اپنے منفرد انداز میں ایوان اقتدار میں داخل ہوا' ایوب خان کو معزول کیا اور حکومت پر قابض ہو گیا۔ اس کے پاس اس اقدام کا کوئی معقول جواز نہیں تھا لہٰذا اس نے فوراً ہی الیکشن کرانے کا ارادہ ظاہر کر دیا اور ایک مختصر التوا کے بعد الیکشن کروا بھی دیئے۔ جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء اس وقت لگایا جب حکومتی پارٹی اور حزب اختلاف میں تمام اختلافات دور ہو چکے تھے۔ سمجھوتہ ہو کر دستاویز کی صورت میں تیار تھا اور صرف دستخط ہونا باقی تھا لہٰذا جو ہنگامی تحریک پی این اے نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے شروع کی تھی مکمل طور پر ختم کر دی گئی تھی۔ اس صورتحال میں مارشل لاءٔ لگانے کا یہ جواز کہ ملک میں ہنگامے ہو رہے اور جان و مال کے نقصان کا خطرہ ہے بڑی کمزور دلیل ہے۔ اس دلیل کی کمزوری کے مدنظر ہی نوّے دن کے اندر الیکشن کرانے کا وعدہ کیا گیا۔ نوّے دن کے بعد چونکہ اور کوئی قابل قبول جواز نظر نہیں آتا تھا لہٰذا ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا فریضہ اپنا لیا گیا۔

گذشتہ دس سالوں میں اس ضمن میں جو کچھ کیا گیا اس کے لئے ایک علیحدہ مربوط مطالعے کی ضرورت ہے لیکن چند ایک اقدامات کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ اولاً کڑی سزائیں' حد تعزیر رجم' کوڑے اور قطع ید کی تجدید کی گئی۔ اس اسلامی اقدام کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ یہاں اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ ان سزاؤں نے مارشل لاء حکومت کو اقتدار پر قبضہ رکھنے میں مدد دی اور اختلاف کرنے والوں کی حوصلہ شکنی۔ زکوٰۃ جو ایک رضاکارانہ ٹیکس ہے زبردستی وصول کرنے کا نظام رائج کیا گیا۔ یہ زکوٰۃ انتظامیہ کی نامزد کمیٹیاں وصول کرتی ہیں جن کو اس کی تقسیم کے لئے کوئی حساب رکھنے کی ضرورت نہیں۔ زکوٰۃ میں سے تعلیم' یتیم خانے' عمر رسیدہ اور بیماروں کے لئے رہائش اور خور دونوش وغیرہ پر خرچ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شہر میں اندھے' لنگڑے لولے' زخموں سے چور سینکڑوں فقیر سڑکوں' گلیوں' چوراہوں پر نظر آتے ہیں' ان کے لئے کوئی رہائش یا نان و نفقہ کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ زکوٰۃ کن لوگوں کو دی جاتی ہے؟۔ زکوٰۃ کے محکمے کا ارشاد ہے کہ مستحقین کو دی جاتی ہے لیکن ان کی فہرست بنانا منع ہے کہ اس سے وصول کنندگان کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ اس کا حساب رکھنے کی ممانعت ہے۔ تمام تقسیم زکوٰۃ کمیٹیوں کی صوابدید پر ہے۔ یہ باضمیر اور خدا ترس لوگ ہیں۔ خیانت نہیں کرتے۔

میرے گاؤں میں انتظامیہ کے نامزد ممبران سب نہیں تو بیشتر سمگلر ہیں۔ سارا گاؤں بلکہ آس پاس کے گاؤں جانتے ہیں لیکن نامزد کرنے والے انتظامیہ کے افسران بالادست کے نزدیک وہ متقی اور پرہیزگار ہیں۔ زکوٰۃ کا یہ استعمال بھی سیاسی مفاد کا حامل ہے۔

بھٹو مرحوم کے دور میں بینکوں کو قومیایا گیا۔ ۱۹۷۳ء کے آئین میں ربوٰ کو بتدریج ختم کرنے کی شق موجود ہے۔ مارشل لاء حکومت نے زبانی کلامی سود ختم کر دیا ہے۔ اس کی جگہ بینکوں میں "سود سے پاک نفع نقصان میں شرکت کی بنا پر کھاتہ داری" کا نظام شروع کیا گیا ہے۔ اصل حقیقت اس نظام کی کیا ہے دنیا جانتی ہے۔ بنک سیدھے سادے طریقے سے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ جب کوئی تجارتی، صنعتی ادارہ یا فرد بنک سے قرض لیتا ہے تو سب سے پہلے اسے کوئی جائیداد بطور ضمانت گروی رکھنی پڑتی ہے۔ اس کے بعد وہ ایک مقررہ رقم بطور منافع بنک کو سالانہ ادا کرتا ہے۔ اگر قرض لینے والے کو نقصان ہو جائے تو بنک کو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ گروی کی ہوئی جائیداد میں سے بنک اپنا اصل اور سود جو منافع کہلاتا ہے وضع کر لیتا ہے۔ تمام قرض دینے والے سرکاری ادارے، پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انوسٹمنٹ کارپوریشن PAKISTAN INDUSTRIAL CREDIT AND INVESTMENT CORPORATION

انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بنک آف پاکستان INDUSTRIAL DEVELOPMENT BANK OF PAKISTAN

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن HOUSE BUILDING FINANCE CORPORATION

سب کے سب اسی اساس پر کام کر رہے ہیں۔ بچت کے سرکاری ادارے بھی اسی طرح منافع کہہ کر سود لیتے اور دیتے ہیں۔ شرح بنک کو سود کی جگہ منافع کا نام دے دیا گیا ہے۔ بنک کھاتے کو نفع نقصان میں شراکت تو کہتا ہے لیکن نقصان میں شریک نہیں ہوتا، منافع ہر صورت لیتا ہے اور مقررہ شرح سے کم نہیں لیتا۔ اس منافع کو سود کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا ملک جو غیر ممالک سے بھاری سود پر اربہا روپیہ لے کر چلتا رہا ہے اور اب بھی چل رہا ہے، سود سے پاک بینکاری کیسے کر سکتا ہے۔ حکومت نے جو کچھ کیا ہے وہ اس کے لئے نیک نامی کی طلب گار ہے، لیکن جو کچھ ہوا ہے وہ محض دکھاوا ہے جو بینکوں نے حکومت کو خوش کرنے کے لئے کیا ہے۔

ایوب خان کے زمانے سے ملک میں ایک اسلامی نظریاتی کونسل چلی آ رہی ہے صدر ضیاء الحق نے شریعت عدالتیں بھی قائم کر دی ہیں۔ عوام کی نظروں میں یہ اسلامی نظام کی طرف ایک مثبت قدم ہے۔ عملی طور پر شریعت عدالتوں کے اختیارات بہت محدود ہیں۔ جسٹس محمد منیر سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ نے اپنی کتاب "جناح سے ضیاء تک" میں لکھا ہے

> "شریعت عدالتوں کے دائرہ اختیار میں نہ تو آئین کی کسی شق کی تفسیر ہے نہ مسلم پرسنل لاء، نہ حکومت کے کسی ضابطے کے خلاف ساعت، نہ کوئی مالیاتی قانون یا

ٹیکس گذاری کا قانون۔ اتنے اہم قوانین کو شریعت عدالتوں کے اختیار میں شامل نہ کرنے کے بعد ان کے پاس رہ کیا جاتا ہے۔ جس میں وہ کہیں کہ یہ اسلام کے منافی ہے"۔

اکثر مقدمات میں شریعت عدالتوں کے فیصلے حکومت کو ناپسند ہوتے ہیں اور حکومت فوراً ان کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کرتی ہے۔ حال ہی میں شریعت عدالت نے فیصلہ دیا کہ حکومت کسی سرکاری ملازم کو اس کی مدّت ملازمت ختم ہونے سے پہلے ریٹائر نہیں کر سکتی۔ الّا کہ اس ملازم کے خلاف کوئی واضح الزام ہو۔ اس فیصلے سے حکومت کی انا پر حرف آتا تھا اور اس کے آمرانہ اختیارات میں کمی۔ لہٰذا حکومت نے فوراً اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کر دی۔ یہ اور بات ہے کہ سپریم کورٹ نے بھی اس فیصلے کو بحال رکھا اور حکومت کو ناچار اپنا قانون بدلنا پڑا۔

اسلامی نظام کے نفاذ کا زیادہ اہمیت کا پہلو سیاسی نظام سے متعلقہ ہے۔ دن رات یہی کہا جاتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ مغربی ویسٹ منسٹر ٹائپ کی جمہوریت مسلمانوں کے فکر و شعور سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ غیر اسلامی ہے۔ اسلام انتخابات وغیرہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ ملک میں ایک مضبوط حکمران ہونا چاہئے جس کی مدد و مشورہ کے لئے ایک مشاورتی کونسل ہو، لیکن حکمران ان کے مشورے کا پابند نہ ہو۔ جنرل ضیاء الحق نے ہندوستان کے ایک ہفتہ وار اخبار سنڈے SUNDAY کو انٹرویو دیا جو پاکستان ہفتہ وار چٹان کے ۱۹ جولائی ۱۹۸۲ء کے شمار میں شائع ہوا۔ فرمایا۔

> "مسلمان، خصوصاً پاکستان کے مسلمان، آمریت پسند حکمران چاہتے ہیں۔ یہ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب اور ایک ہی حکمران کے ماننے والے ہیں۔ اسلام میں یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کہ کسی نے اقتدار کیسے حاصل کیا۔ جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ حکمران ایمان رکھتا ہو اور عملاً مسلمان ہو۔ اگر وہ ایسا ہے تو لوگ اس کی اطاعت کرتے ہیں ورنہ اسے نکال دیتے ہیں!"

ایک دفعہ جنرل ضیاء الحق نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ سوائے خدا کے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد یہ مؤقف بدل لیا۔ ڈیفنس سائنس جرنل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ وہ خدا، اپنے ضمیر اور عوام کے سامنے جوابدہ ہیں۔ صحافت کے میدان میں نڈر اور بےباک تبصرہ نگار ارشاد احمد حقانی نے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے ۳۰ جون ۱۹۸۲ء کو شمارہ جنگ میں لکھا۔

> "ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے صدر نے کہا ہے کہ وہ اور ان کے رفقا خدا، اپنے ضمیر اور عوام کے سامنے جوابدہ ہیں۔ خدا اور ضمیر کے سامنے جوابدہی ایک دل کا اور ذاتی معاملہ ہے اور اس کی جانچ کا کوئی پیمانہ نہیں ہے۔ جہاں تک عوام کے سامنے

جوابدہی کا تعلق ہے اس کا نہایت معروف طریق کار اور پیمانہ ہے۔

آپ اپنے ساڑھے پانچ سالہ دور حکومت کو اس لئے حق بجانب کہتے ہیں کیونکہ عوام نے آپ کے خلاف گلیوں میں نکل کر احتجاج نہیں کیا۔ یہ پیمانہ مقبولیت یا احتساب کا طریقہ مختلف ہے ان طریقوں اور پیمانوں سے جو دنیا بھر میں مروّج ہیں۔ درست پیمانہ مقبولیت یہ ہے کہ ایک مقررہ مدت کے بعد حکمران عوام سے آزاد اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے اپنی مقبولیت کی توثیق مانگتے ہیں۔ جس ملک یا معاشرے میں یہ طریق احتساب مروّج ہے صرف وہی معاشرہ اپنے حکمرانوں کا صحیح احتساب کر سکتا ہے۔ آپ نے یہ طریق کار نہیں اپنایا اس لئے آپ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آپ عوام کے سامنے جوابدہ ہیں"۔

۶ ستمبر ۱۹۸۵ء کے شمارہ نوائے وقت میں ایک مضمون نگار MALISE RUTHREM نے "ملّا اور جدید اسلامی ملک" کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ اس مضمون میں اسلامی مملکت کا نظریہ زیر بحث آیا ہے، امام خمینی کا انقلاب اور ایران سمیت دیگر ممالک میں جہاں احیائے اسلام کا عمل جاری ہے، مغربی نظریات کی مخالفت کے پہلو پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مضمون نگار کا مفروضہ ہے کہ یہ تحاریک دراصل مذہبی لباس میں مغربی تہذیب اور اس کے تمام شاخسانوں کے خلاف قومی (نیشنلسٹ) بغاوت کے مترادف ہیں لیکن اگر ایسا ہے تو پھر مغرب کے حواری صدر ضیاء الحق اور نمیری جو نفاذ اسلام کی بات بھی کرتے ہیں اور امریکہ کی امداد پر تکیہ بھی کرتے ہیں، کیسے انقلابی ہیں؟ یا وہ محض اندرون ملک عوام کی حمایت اور تائید کے خواہاں ہیں۔

"اسلامی قانون اور رواج سے وابستہ قومیں جیسے سعودی عرب، آمر حکمرانوں کے زیر نگین ہیں لیکن ان کی تمامتر وابستگی مغربی ممالک کے ساتھ ہے۔ یہاں تک وہ امریکہ سے فوجی امداد پر مکمل انحصار کرتے ہیں، ایسے ہی جیسے کسی زمانے میں شاہ ایران کرتا تھا"۔

ایسا کیوں ہے اس سوال کا جواب ترقی پسند مسلمان خود ہی دیتے ہیں۔ نمیری، ضیاء، فہد، خلیج کے ممالک کے شیوخ حقیقی طور پر انقلابی مسلمان نہیں ہیں۔ یہ سب محض اندرون ملک اپنی حکومت کا جواز مہیا کرنے کے لئے اسلام کے نام کو استعمال کرتے ہیں اور حکومت میں رہ کر امریکہ کی سامراجی پالیسی کو فروغ دیتے ہیں۔ اگر ان کو امریکہ کی حمایت اور امداد میسر نہ ہو تو یہ سب کے سب اقتدار سے ہاتھ دھو بیٹھیں

جیسے کہ نمیری کے ساتھ ہوا جب وہ مسلمان عوام کے قہر و غضب کے سامنے ایک پل نہ ٹھہر سکا۔"

اسلام کے نام پر ہر قسم کے دلائل کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ مقصد اولاً تو اقتدار میں رہنا ہے اور دوئم قابل نفرین پیپلز پارٹی کو اقتدار سے دور رکھنا' خصوصاً اگر کبھی اقتدار عوام کے نمائندوں کو سونپنے کا موقع آئے۔ بیچارہ اسلام! شاید اس سے پہلے کبھی اتنی بے رحمی سے استعمال نہیں ہوا۔

جولائی ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء کے نفاذ پر عوام کا ردّ عمل ملے جلے جذبات کا حامل تھا۔ بعض نے اس میں یہ خیریت دیکھی کہ پی این اے کی تحریک کے ہنگامے جو بظاہر تو سمجھوتہ ہونے پر ختم ہو چکے تھے ، دوبارہ نہ شروع ہو جائیں۔ بعض دور رس نگاہ رکھنے والوں نے اسے فوجی جرنیلوں کا طویل المیعاد منصوبہ سمجھ کر تاسف کے جذبات کا اظہار کیا' خصوصاً نوے دن میں الیکشن کرانے کی تیاری کی بجائے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مقدمہ چلانے کی مہم جاری ہوئی۔ سخت پابندی' سنسر شپ' کوڑوں کی سزا اور دیگر سزاؤں کے باوجود وقتاً فوقتاً حکومت کے خلاف اکّا دکّا آواز اٹھتی رہی۔ حیدر آباد سازش کے ملزمان بشمول عبدالولی خان' غوث بخش بزنجو' عطاءاللہ مینگل اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو رہا کر دیا گیا اور ان کے خلاف چلایا گیا سازش کا مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ صدر ضیاءالحق نے اپنی زبان سے ان سب کی حبّ الوطنی کی تعریف کی۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی مارشل لاء کے حق میں کوئی کلمہ خیر نہ کہا۔ بلکہ ہر ایک نے مارشل لاء کی مذمت کی اور کہا کہ مکمل جمہوریت کے سوا ان کو اور ان کی پارٹیوں کو اور کوئی طرز حکومت قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ مخالفت آہستہ آہستہ پروان چڑھتی رہی اور بالآخر اس نے تحریک برائے بحالی جمہوریت MOVEMENT FOR RESTORATION OF DEMOCRACY یا ایم۔ آر۔ ڈی کا روپ دھار لیا۔ ایم آر ڈی میں تقریباً سب پارٹیاں شامل ہو گئیں۔ ماسوائے جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے جن کا حکومت کے ساتھ مکمل تعاون رہا اور ان پارٹیوں کے ممبران حکومت میں شامل بھی رہے۔ مسلم لیگ کا خواجہ خیرالدین گروپ البتہ ایم۔ آر۔ ڈی میں شامل ہوا۔

صدر نے پہلے تو ایم۔ آر۔ ڈی کو در خور اعتنا نہ سمجھا اور ایک موقع پر ان کو دھمکی بھی دی۔ لیکن جیسے جیسے ان کی تحریک نے زور پکڑا صدر نے سنجیدگی سے صورتحال کو دیکھ کر الیکشن نزدیک لے آنے کا اشارہ بھی کیا۔ عین اسی وقت پی آئی اے کے طیارے کا اغوا ہوا جس میں ایک جان کا ضیاع بھی ہوا۔ عوام اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئے اور ایم آر ڈی کی تحریک کو شدید نقصان پہنچا۔ چنانچہ مارشل لاء حکام نے پھر سے سخت گیری کی پالیسی اختیار کر لی۔

وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو اس کا کوئی فوری اور شدید ردّ عمل نہ ہوا۔ لیکن تمام ملک میں عموماً اور سندھ میں خصوصاً پیپلز پارٹی کے ممبران میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ سندھ میں ڈاکے' اغوا'

سڑکوں اور ریل پر ڈاکے ' تخریب کاری کی وارداتیں ہونے لگیں۔ باوجود سخت اقدامات کے یہ وارداتیں نہ رکیں 'بلکہ اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود ابھی تک جاری ہیں۔ صدر نے اندرون سندھ دورہ کیا تو متعدد جگہوں پر تشدّد آمیز واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے انتظامیہ کیلئے بہت سر دردی رہی۔ لیکن موقع پر انتظامیہ کے افسروں نے صدر سے یہی کہا کہ یہ وارداتیں جرائم کی نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کی ہیں جن کا مدعا صوبے کی سیاسی اور معاشی محرومیوں کا احساس دلانا ہے۔ یہ کام ان عناصر کا ہے جو اصولی طور پر وفاق سے ہی منحرف ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اس تحریک کا حل بھی سیاسی ذرائع سے ہو گا نہ کہ انتظامی کنٹرول سے۔ لوکل انتظامیہ کی ان عرضداشتوں کو نظر انداز کر کے صوبے میں فوج اور پولیس کی مزید نفری اس تحریک کو کچلنے کیلئے تعینات کر دی گئی۔ کھلی تحریک جو گلیوں بازاروں میں پھیلی چکی تھی۔ ختم کر دی گئی لیکن اغوا' ڈاکے وغیرہ بند نہ ہو سکے۔

جیسے جیسے انتظامیہ اور فوج کا دباؤ بڑھا نوجوان طبقہ اور بدظن ہوتا گیا اور جئے سندھ کی تحریک کو ہزاروں نئے رنگروٹ مل گئے۔ ہندوستان اس علیحدگی پسند تحریک کی پشت پناہی کر رہا ہے جس کی وجہ سے اس میں تشدّد کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ مسز اندرا گاندھی اور اس کے وزیر خارجہ نرسیما راؤ نے اعلانیہ کہا کہ

> انہیں سندھی اور بلوچی عوام کی محرومیوں کا احساس ہے۔ انہوں نے پاکستان کے اندرونی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایم آر ڈی سے ہمدردی اور حمائت کا اظہار کیا۔

یہاں بھی عین وہی نقشہ ہے جو مشرقی پاکستان میں تھا۔ یعنی ہندو آبادی درپردہ وفاق کی مخالفت 'تشدّد اور تخریب کاری کی نشرو اشاعت کیلئے کوشاں ہے۔ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کا نعرہ اپنی مقبولیت کھو بیٹھا ہے لیکن سندھ میں تو اس کے بالکل برعکس پروپیگنڈا ہو رہا ہے کہ زمانہ جاہلیت یعنی قبل از اسلام کے سورماؤں کے گن گائے جا رہے ہیں اور نظریۂ پاکستان کی کھلی مخالفت ہو رہی ہے۔ جئے سندھ تحریک کا بانی جی ایم سید پھر سرگرم عمل ہے۔ ایک ہندوستانی اخبار کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے جی ایم سید نے کہا کہ

> "ہندوستان اور سندھ کا الحاق ہونا چاہئے۔ اس نے پاکستان کی ہر طرح سے مذمت کی اور یہ بھی کہا کہ ہندوستان اور پاکستان میں جنگ ہوئی وہ اور اسکے پیروکار ہندوستان کا ساتھ دیں گے۔ جی ایم سید نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ اس نے پاکستان کے خلاف مسز اندرا گاندھی سے مدد کی درخواست بھی کی تھی لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بہرطور اسے یقین ہے کہ پاکستان چند دن کا مہمان ہے پھر یہ دنیا کے نقشے سے نابود ہو جائے گا اور یہ خطہ دوبارہ ہندوستان کا حصہ بن جائے گا۔

آخر میں جی ایم سید نے بھی کہا کہ وہ جنرل ضیاء الحق سے بہت خوش ہے کیونکہ جنرل صاحب خود ہی ملک کو توڑ رہے ہیں۔"

غوث بخش بزنجو جو بلوچستان کا واحد اعتدال پسند لیڈر ہے اس بات پر اصرار کر رہا ہے کہ آئین میں یہ شق رکھی جائے کہ اگر ملک میں پھر کبھی مارشل لاء لگایا گیا تو صوبوں کو اختیار ہونا چاہئے کہ ان میں سے جو بھی چاہے وفاق پاکستان سے علیحدہ ہو جائے۔ بلوچستان کے دیگر لیڈر، عطاء اللہ مینگل، خیر بخش مری، شیر محمد مری وغیرہ ملک چھوڑ کر انگلستان میں بطور سیاسی پناہ گیر بیٹھے ہوئے ہیں اور کسی اچھے وقت کے انتظار میں ہیں۔ روزنامہ جنگ کو انٹرویو دیتے ہوئے عبدالولی خان نے کھلے الفاظ میں، شاید پہلی مرتبہ کہا کہ

> اس نے اور اس کی پارٹی نے پاکستان کی تخلیق کی مخالفت کی تھی اور پاکستان کے مطالبے کی مخالفت میں ہندو کانگرس پارٹی کی امداد کی تھی۔ اس نے کہا، کہ پاکستان کوئی آسمانی صحیفہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی مخالفت کوئی گناہ۔

عبدالولی خان کے نظریات ملک بھر میں لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہیں ماسوائے صدر اور ان کے رفقاء کے جو اسے ایک عظیم محب وطن سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں یہ مارشل لاء کی حکومت کی کمزوری کا مظہر ہے کہ گو وہ صبح شام اعلان کرتے ہیں کہ ملک کی سالمیت اور نظریہ پاکستان کے خلاف ایک لفظ برداشت نہیں کریں گے لیکن عبدالولی خان، بزنجو یا جی ایم سید کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے گھبراتے ہیں۔

۱۹۷۷ء کا مارشل لاء بھٹو کی حکومت کو ختم کرنے کیلئے ضروری تھا۔ اسی طرح بھٹو کے مقدمے اور اس کی سزا کی تکمیل تک بھی مارشل لاء اٹھا دینا ممکن نہیں تھا۔ لیکن اس کے بعد تو مارشل لاء کا جاری رہنا امریکہ کی حمایت اور پشت پناہی پر ہی ممکن تھا۔ چنانچہ ایران کا انقلاب اور افغانستان میں روسی فوجوں کی مداخلت مارشل لاء کے ٹولے کیلئے باران رحمت ثابت ہوئے کہ یکایک امریکہ کیلئے پاکستان اور مارشل لاء حکومت کی اہمیت دوچند ہو گئی۔ اس طرح پاکستان کو ۳۲ ارب ڈالر کی امداد فراہم ہو گئی جس نے حکومت کو استحکام دیا۔ ایک عرصہ تک امریکی پالیسی یہی تھی کہ روسی فوجیں افغانستان میں برسرپیکار رہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنی اس پالیسی کے تحت پاکستان کو خوب خوب استعمال کیا۔ پاکستان کے اپنے حق میں یہ پالیسی مفید ہے یا مضر اس سے نہ امریکہ کو واسطہ ہے اور نہ ہی پاکستان کے حکمرانوں کو اس کی کوئی پرواہ معلوم ہوتی ہے۔ حکمران ٹولے کو تو فوری امداد چاہئے تاکہ ان کی حکومت قائم رہ سکے۔

غیر جماعتی الیکشن اور مارچ ۱۹۸۵ء کی آئینی ترامیم نے وزیر اعظم کو ایک کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا ہے۔ لہٰذا ان کا بیشتر وقت اس مہم میں گذرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ممبران اسمبلی کو اپنے ساتھ رکھیں۔ ساتھ ساتھ مختار کل صدر کے ہمرکاب رہنا بھی لازمی ہے۔ شروع شروع میں تو وزیر اعظم کو صدر کا سایہ کہا جاتا

تھا۔ آئینی ترامیم کا مقصد بھی یہی تھا اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مارشل لاء حکام نے ایک بار پھر عوام اور ان کے نام نہاد نمائندوں کو مات دے دی۔ سیاسی عمل جو کسی بھی ملک کے وجود کیلئے لازمی ہے ختم کر دیا گیا اور سیاسی پارٹیاں کالعدم ہو گئیں۔ اس طرح نام نہاد اسمبلیوں کے سروں پر مارشل لاء کا سایہ موجود رہا۔ الیکشن جیسے بھی ہوئے عوام نے اپنی سیاسی بصیرت اور ہوشمندی کا مظاہرہ کر دکھایا۔ مارشل لاء کے تمام چہیتے امیدوار ناکام رہے اور ان کے ساتھ ملا بھی جو حکومتی چھاپ کے اسلام کے علمبردار تھے۔

بالآخر اسمبلیوں میں روزمرہ کا کاروبار دوبھر ہو گیا اور انتظامیہ پر اس کا بہت برا اثر پڑنے لگا۔ وزیر اعظم کو شدت سے احساس ہوا کہ پارٹی اور پارٹی کے نظم وضبط کے بغیر حکومت چلانا ممکن نہیں۔ صدر نے بھی دیکھ لیا کہ حکومت کی مشینری ٹھپ ہوئی جاتی ہے۔ اسلئے انہوں نے اپنا سخت مؤقف ترک کیا اور سیاسی جماعتوں کی بحالی ہوئی اسمبلیوں میں سیاسی جماعتی نظم وضبط لوٹ آیا اور وزیر اعظم کی توجہ اس مخمصے سے نکل کر حکومت کے کاروبار کی طرف مبذول ہوئی۔

ط:۔ ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہونا

سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کا بیٹا شاہنواز بھٹو پیرس کے ایک ہوٹل میں پراسرار حالات میں مردہ پایا گیا۔ اس کی نعش کو پاکستان میں ان کے آبائی گاؤں میں لایا گیا۔ سندھ کے لوگوں نے کئی دن تک سوگ منایا۔ ایک جم غفیر جنازے میں شریک ہوا۔ دوسرے صوبوں سے بھی لوگ آئے۔ بعض ایسے سیاسی لیڈر جن کی نقل وحرکت پر پابندی تھی۔ چھپ چھپا کر پہنچے۔ شاہنواز کی ہمشیرہ بے نظیر بھٹو جو پیپلز پارٹی کی شریک صدر ہے' نے خواہش ظاہر کی کہ وہ سب صوبوں میں جاکر لوگوں کی ہمدردی اور عزاداری کا شکریہ ادا کرے۔ اسے فوراً حراست میں لے لیا گیا۔ جب بے نظیر بھٹو نے پیرس سے بھائی کی نعش کے ساتھ آنے کے ارادے کا اظہار کیا تو وزیر اعظم نے کہا تھا کہ وہ پاکستان آئے اور آزادی سے جہاں چاہے جائے اسے کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔ لیکن اس کی نظر بندی مارشل لاء حکام کے حکم سے ہوئی، ایسے موقع پر جبکہ بیچاری سوگوار ہمشیرہ مرحوم بھائی کی موت کی رسوم ادا کر رہی تھی۔ اس کی نظر بندی پر دوسرے ملکوں میں شدید ردّعمل ہوا۔ انگریزی اور امریکن پریس میں خاص طور پر اس اقدام کو اچھالا گیا۔ انگریزی پارلیمینٹ اور امریکی وزارت خارجہ میں بھی شدید ردّعمل کا اظہار ہوا۔ پاکستان کی حکومت نے کھسیانی سی وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن کسی کو یقین نہ آیا۔ بالآخر مس بھٹو کو رہا کر دیا گیا۔

ماحصل

ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ مارشل لاء کے مضمرات کیا ہیں اور اس کا ماحصل کیا ہے؟ کیا بار بار مارشل لاء لگنے سے ملک اور قوم کی تقدیر متاثر ہوئی ہے؟۔ جواب زبان یا قلم سے دینے کی ضرورت

نہیں ہر ذی شعور انسان دیکھ اور محسوس کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی وفات اور لیاقت علی کے قتل کے بعد ملک میں ایک سیاسی خلاء پیدا ہو گیا تھا' لیکن کسی نہ کسی صورت سے سیاسی عمل کا آغاز ہو چلا تھا۔ ۱۹۵۶ء کا آئین اس کی بنیاد تھی اور ۱۹۵۹ء کے اوائل میں ہونے والے انتخابات نے اس بنیاد پر قومیت کی عمارت تعمیر کرنی تھی۔ لیکن ۱۹۵۸ء کے فوجی عمل نے اس عمارت کو نہ صرف شروع ہی نہ ہونے دیا بلکہ اس کی بنیاد بھی اکھاڑ پھینکی جس کیلئے تاریخ ایوب خان کو کبھی معاف نہیں کریگی۔ ایک نوزائیدہ ملک کیلئے دس سال کوئی اتنا طویل عرصہ نہیں کہ جس میں قوم کی اہلیت اور سیاسی شعور پر اتنا کڑا اور یکطرفہ فیصلہ صادر کر دیا جائے۔ اور اسے مارشل لاء کے قعر آمریت میں دھکیل دیا جائے۔

جسٹس محمد یعقوب علی' جج سپریم کورٹ نے عاصمہ جیلانی بنام سرکار کے مشہور مقدمے کے فیصلہ میں لکھا ہے۔

> "سکندر مرزا اور ایوب خان نے رمل کر شب درمیان ۷ اور ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو قوم کے قانونی نظام کو اکھاڑ پھینکا۔ ان کا یہ اقدام صریح بغاوت کا جرم تھا۔ یہ کرتے وقت انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ ۱۹۵۶ء کا دستور جسے وہ منسوخ کر رہے تھے ایک ایسا عہد تھا جس کے تحت مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام نے بطور ایک قوم مل کر رہنے کا تہیہ کیا ہوا تھا اور یہ کہ یہ عہد بڑی لگن اور بڑے جتن سے معرض وجود میں آیا تھا۔ چنانچہ ان کا یہ اقدام مشرقی اور مغربی پاکستان کے عوام کی یکجہتی پر ایسی ضرب کاری ثابت ہوا جو تیرہ برس بعد مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں رنگ لائی"۔

ایک فوجی آمر کی سیاسی فلاسفی ہو بھی کیا سکتی ہے ماسوائے اس کے کہ وہ کسی نہ کسی حیلے بہانے سے لوگوں کے ذہنوں میں بے یقینی اور پریشانی پیدا کرے۔ وہ خود کو اور اپنے ہمرکابوں کو عقل کل سمجھتا ہے اور توقع کرتا کہ پوری قوم اس کے اشاروں پر چلے' حکم بجالائے اور اس کی ہربات پر آمین کہے۔ لوگ زچ ہو کر ریاست کے کاروبار سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور یہی سیاسی عمل کی موت ہے۔ مارشل لاء کے نظام کی یہ یقینی اور ناقابل تردید پیداوار ہے۔ ہنگامی صورت حالات میں جبکہ امن عامہ برقرار نہ رہ سکے اور سول انتظامیہ امن بحال کرنے میں عہدہ برانہ ہو سکے تو اس صورت میں سیاسی عمل میں تعطل ایک قدرتی نتیجہ ہے۔ لیکن ہنگامی حالات پر قابو پا لینے کے بعد ایک ایک دن جو سیاسی عمل کی بحالی کی تاخیر میں گذرتا ہے، وہ قوم کو پیچھے لے جاتا ہے۔ قومی اداروں کو کمزور کرتا ہے اور ریاست کی جڑوں کو کھوکھلا کرتا ہے۔ دو مثالیں اس حقیقت کو واضح کرنے کیلئے پیش ہیں۔ اولاً گو شروع دن سے مشرقی پاکستان کے عوام کو شکایت رہی کہ ترقیاتی دوڑ میں وہ بہت پیچھے رہ گئے تھے اور وفاقی حکومت ان کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا

سلوک کر رہی تھی لیکن کسی نے کبھی علیحدہ ہونے کی بات نہیں کی تھی۔

جسٹس محمد منیر نے اپنی کتاب "جناح سے ضیاء تک" میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اسمبلی کی روئیداد سن کر منیر کو خیال گذرا کہ آئے دن کے شاکی بنگالی ممبران شاید مشرقی پاکستان کو الگ ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایوب سے ذکر کیا اور اس کے کہنے پر چند برسرآوردہ بنگالی لیڈروں کو گھر بلایا' چائے پلائی اور باتوں باتوں میں پوچھا کہ کیا وہ لوگ علیحدگی چاہتے ہیں۔ اس پر سب کے سب بنگالی بھڑک اٹھے اور یک زبان ہو کر بولے "دیکھو منیر ہم آبادی کے لحاظ سے ملک کا بڑا حصہ ہیں اور پاکستان ہیں۔ اگر تم لوگ الگ ہونا چاہتے ہو تو اور بات ہے"۔

یہ ۱۹۶۲ء کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ پہلا مارشل لاء بھی لگ چکا تھا لیکن مشرقی پاکستانیوں کو امید تھی کہ اب بھی ملک کے حالات سدھر جائیں گے اور ان کیلئے حکومت اور ریاست کے کاروبار میں باعزت مقام مہیا ہو گا۔ بعد میں' باوجود ترقیاتی پروگرام میں خصوصی رعائتوں اور اولیت کے ہم انہیں ساتھ نہ رکھ سکے کیونکہ دوسرے مارشل لاء کے بعد انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب حکومت میں ان کیلئے کوئی جگہ نہیں رہی۔ مارشل لاء آتے رہیں گے اور وہ ایک نو آبادی کی حیثیت میں دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ جائیں گے۔ لہٰذا انہوں نے ۱۹۷۱ء میں جان و مال کے بے پناہ ضیاع کے بعد اس سیاسی غلامی سے جان چھڑائی اور علیحدہ ریاست قائم کی۔

دوسری مثال اس سانحے کے بعد کی ہے جب بھٹو کے دور میں ملک کی تمام دائیں بائیں بازو کی جماعتوں نے مل کر ۱۹۷۳ء کا آئین مرتب کیا اور اسے متفقہ طور پر پاس کیا۔ کچھ عرصہ بعد فرنٹیر اور بلوچستان کی حکومتوں کو معطل کر دیا گیا' سیاسی لیڈروں پر پابندیاں عائد ہوئیں۔ این اے پی کو خلاف قانون قرار دیکر کالعدم کر دیا گیا بلوچستان میں زبردست فوجی ایکشن ہوا۔ لیکن کسی کونے سے آئین میں ترمیم کی آواز نہ نکلی۔ کوئی جماعت نہ کوئی فرد اس متفقہ آئین کی مخالفت پر اٹھا اور نہ ہی کسی نے ملک توڑنے کا یا فیڈریشن کو کنفیڈریشن میں بدلنے کا مطالبہ کیا جو آوازیں' مخالفت اور مطالبے اب برسرعام سنے اور دیکھے جا رہے ہیں۔

بھارت پاکستان کے مقابلے میں ایک بڑا ملک ہے۔ اس کے مسائل بھی اس کے حجم کے مطابق بڑے اور زیادہ پیچیدہ ہیں۔ ایک آبادی میں اضافے کی شرح ہی اتنی بے قابو اور لامتناہی ہے کہ ہر قسم کی ترقی کی راہ میں دیوار بنی ہوئی ہے۔ ابتدا میں مہاتما گاندھی کا قتل ہو گیا۔ علیحدگی پسندی' خصوصاً جنوب میں دراوڈا کاضاکم پارٹی کا مطالبہ خود مختاری مشرق نے ناگا' میزو اور دوسرے قبائل کی مسلسل بغاوت اور شمال میں سکھوں کا خالصتان کی الگ ریاست بنانے کا مطالبہ متعدد حکومتوں کیلئے ایک دردسر بنا رہا ہے۔

غربت ' بے روز گاری ' نوکر شاہی ' بد دیانتی '' غریب امیر میں تضاوت میں سب مسائل موجود ہیں۔ تقسیم سے لیکر ابتک ہندوؤں نے مسلم کش پالیسی ترک نہیں کی۔ آئے دن لوٹ مار قتل اور آتش زنی کی وارداتیں ہوتی ہیں اور حکومت کی چشم پوشی کی وجہ سے ہندو غنڈوں کے مذہبی جنون کی مزید پرورش ہوتی ہے۔ ہریجن ہر روز مارے جاتے ہیں ' زندہ جلائے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں ہند چینی سرحد پر جنگ میں شرمناک ہزیمت کی ذلت بھی اٹھانی پڑی۔ حکومتی پارٹی نیشنل کانگرس کیلئے سخت وقت آئے اور ایک دفعہ تو اندرا گاندھی جیسی طاقتور حکمران کو الیکشن میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام نامساعد حالات کے باوجود ہندوستان میں کسی فوجی جرنیل نے کبھی عنانِ حکومت سنبھالنے اور حکومت پر قبضہ کرنے کا نہیں سوچا اور نہ ہی کسی نے ایسی جرأت کی ہے۔ نتیجتہً یہ اتنا بڑا ملک جو صحیح معنوں میں ایک برّ صغیر ہے دنیا بھر میں ایک بہت بڑی جمہوریت ہونے کی رعایت سے عزت اور توقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ سپر پاور زا سکی دوستی کیلئے پیہم کوشاں رہتی ہیں۔ بین الاقوامی اداروں اور پلیٹ فارموں پر اس کی رائے کو قدرومنزلت حاصل ہے۔ تحریک غیر جانبداری NON ALIGNMENT MOVEMENT اس کا خاص مقام ہے۔

> اگر ہندوستان بھی کبھی مارشل لاء اور فوجی آمریت کی آفت سے دوچار ہوتا تو اب تک تین یا چار حصوں میں بٹ چکا ہوتا۔ کیونکہ ہندوستان میں پاکستان کے مقابلے میں کہیں زیادہ مختلف النوع لوگ بستے ہیں۔ لیکن ہندوستان اگر آج بھی متحد ہے تو فقط جمہوریت کے شورو غوغا سے ''۔

پاکستان میں مشرقی اور مغربی حصوں کے مختلف قومیت کے حامل لوگوں نے مکمل آزادی رائے سے اکٹھے رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے مل کر ایک متفقہ آئین بنایا جو اس فیصلے اور یکجہتی کا زندہ ثبوت تھا۔ لیکن شب درمیان ۷ اور ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی شب کا واقعہ جس کا ذکر اوپر دیئے گئے سپریم کورٹ کے فیصلے میں کیا گیا۔ اس کم نصیب ملک کی تاریخ کا ایک بھیانک باب ہے اِس واقعے نے ملک کی سیاست میں اختلاف ' تخریب اور علیحدگی کے بیج بوئے۔ چنانچہ بائیس سال کی جرنیلوں کی حکومت کے بعد جو فصل پک کر تیار ہوئی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ سیاسی عمل روک دیا گیا۔ سیاستدانوں کو ہر طرح سے بدنام کیا گیا۔ اور کس خوبی سے سیاسی اقتدار کو صحیح وارثوں کو میدان سیاست سے نکال دیا گیا ' جیلوں میں ٹھونسا گیا ملک بدر کیا گیا ' حتیٰ کہ پھانسی تک لگادی گئی۔ سیاسی پارٹیوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ سیاسی ادارے بند اور بے اثر ہوگئے۔ عدالتوں کے اختیارات محدود کر دیئے۔ بنیادی حقوق چھین لئے۔ عوام پر فوجی عدالتیں نازل ہوگئیں — ان کے فیصلے پر نظر ثانی تک کا اختیار ملک کی بڑی سے بڑی عدالت سے بھی چھین لیا گیا۔ فوجی عدالتوں سے ہولناک سزائیں ، سرعام کوڑے ' پھانسی اور یہاں تک ایک باعزت

'مشرع' ریٹائرڈ افسر کو ایک ناکردہ جرم کی سزا میں منہ کالا کر کے گدھے پر بیٹھا کر شہر میں گھمایا گیا۔ ان نامتناسب سزاؤں کا مقصد یکسر انسانی تذلیل اور عوام کے ذہنوں میں خوف اور ہراس پیدا کرنا ہے تاکہ ان میں کسی قسم کے احتجاج کی جرأت باقی نہ رہے۔ انتخاب کا نظام درہم برہم کیا گیا تاکہ اپنی حکومت جاری رہ سکے۔ ایوب کا بنیادی جمہوریت کا نظام ہو یا صدر ضیاء الحق کا ریفرنڈم' مقصد ایک ہی ہے۔

حکمرانوں نے مارشل لاء کے تحت اور اس کے بعد نئے آئین یا ترمیم شدہ آئین کے تحت غیر محدود اختیارات حاصل کر لئے۔ سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں میں چپقلش کو ہوا دی گئی کہ ان کے آپس کے اختلافات میں غیر نمائندہ حکومتوں کو عافیت ملتی رہے۔

خزانے پر دفاع کا بوجھ بعض اوقات کل بجٹ کا ۷۰ فیصد تک جا پہنچتا ہے۔ مارشل لاء کے زمانے میں ہر افسر کو مارشل لاء ڈیوٹی کیلئے مزید تنخواہ ملتی ہے۔ لہٰذا مختلف اوقات میں یہ اخراجات اس حد تک جا پہنچے ہیں کہ ان کی خاطر لئے گئے قرضہ جات کی ادائیگی بھی ایک مدت تک ہوتی رہے گی۔

خود فوج کو سیاسیات میں اتنا الجھا دیا گیا ہے اور اقتدار سے اسطرح آشنا کیا گیا ہے کہ ان کی عسکری پیشہ ورانہ اہلیت یقیناً اثر پذیر ہوئی ہو گی۔

ملک میں جرنیلوں کی بائیس سالہ حکومت کا سیاسی ماحصل تباہ کن رہا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے ملک کا آدھا حصہ کٹ گیا۔ مغربی پاکستان میں کھلے بندوں کنفیڈریشن کی باتیں ہو رہی ہیں۔ بلوچستان کے لیڈر کہہ رہے ہیں کہ دوبارہ مارشل لاء لگنے کی صورت میں ان کے صوبے کو علیحدگی کا اختیار ہونا چاہئے۔ سندھ میں سندھو دیش کا پرچار ہو رہا ہے۔ جی۔ ایم سیّد فخریہ کہتا ہے کہ بھارت سے حملے کی صورت میں وہ اور اس کے پیروکار پاکستان کے خلاف لڑیں گے۔ شمال مغربی سرحد پر گذشتہ مارشل لاء نے وہ کر دکھایا ہے جو سردار داؤد اور عبدالغفار خان نہ کر سکے۔ یعنی ایک بنا بنایا پختونستان جو چالیس لاکھ افغان مہاجرین پر مشتمل ہے اور جو پاک افغان سرحد پر گذشتہ نو سال سے بیٹھے ہوئے پاکستان کی میزبانی کی داد دے رہے ہیں۔ اب یہ معزز مہمان اسلحہ اور منشیات کی سمگلنگ کرتے ہیں اور ان کی اس کرم نوازی سے پاکستان کو دنیا کا نمبر ایک منشیات کا فراہم کنندہ ملک ہونے کا شرف حاصل ہو گیا ہے۔ جہاں تک اسلحہ کا تعلق ہے ملک بھر میں کلاشنکوف رائفل کھلے بندوں دستیاب ہے اور 'چشم بد دور' خوب استعمال بھی ہو رہی ہے۔ جب امریکی امداد بند ہو گئی تو افغان مہاجرین کیا کیا نہیں کریں گے یہ سوچتے ہوئے بھی خوف آتا ہے۔

قصہ کوتاہ' ملک میں مارشل لاء اور جرنیلوں کی آمریت کا سیاسی ماحصل بس یہی ہے کہ عام' پرامن سیاسی زندگی درہم برہم ہو گئی' سیاسی اور سماجی ادارے تباہ ہو گئے' ملک دو نیم ہو گیا' بد دیانتی کا دور دورہ ہے' عوام استبداد کی زد میں ہیں' خارجہ پالیسی خود کشی کے مترادف ہے' اور دنیا کے ممالک میں

ہماری ساکھ اٹھ گئی ہے۔ ملک کے اندر اور باہر شکوک پیدا ہو رہے ہیں کہ پاکستان رہتا بھی ہے یا نہیں۔ لندن کے اخبار گارڈین نے گذشتہ مارشل لاء کے لگنے پر ۲۳ ستمبر ۱۹۷۷ء کو ایک اداریے میں لکھا تھا۔

" پاکستان ایک بڑا ملک ہے جو جغرافیائی محل وقوع کی بناء پر اہم ہے، لیکن جو اس وقت ایک مشکل دور سے گذر رہا ہے۔ اسے آزاد ہوئے تیس سال ہو گئے لیکن ان تیس سالوں میں عوام ہر لحہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا ہم لوگ من حیث القوم عالم وجود میں بھی ہیں یا نہیں۔ اس سوال کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ کیا جناح کا تخلیق کردہ " یہ پاکیزہ " ملک مذہب کی اساس پر قائم ہے یا یہ محض تاریخ کا ایک حادثہ ہے؟ کیا یہ وفاق واقعی شامل صوبوں کی رضا و رغبت کا مظہر ہے، اور بطور وفاق ایک زندہ حقیقت ہے یا پنجابیوں کی آمریت کا گڑھ ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ ہی کیا اس ملک میں، جہاں اظہار رائے کے مواقع نہ ہونے کے برابر ہیں، جمہوریت کی کوئی جگہ ہے جس کے تحت لوگ آزادی رائے رکھ سکیں؟ علاوہ بریں تیس سال میں اکثر و بیشتر فوجی مداخلت کے مد نظر کیا فوجی سربراہ، ایوب، یحیٰی اور ضیاء الحق سیدھے سادے پیشہ ور فوجی ہیں یا سیاسی اقتدار کے طلبگار جو فوج کا پیشہ اسلئے اختیار کرتے ہیں کہ یہی اقتدار حاصل کرنے کا آسان راستہ ہے؟ "

طارق علی نے اپنی تازہ کتاب " کیا پاکستان قائم رہ سکتا ہے؟ " CAN PAKISTAN SURVIVE میں لکھا ہے

" یہ کیسی ریاست ہے جو ملاؤں کے بے اصول استعمال سے زندہ ہے، جہاں بندوق اور مغربی ممالک سے درآمد کردہ آلات اذیت سے حکومت ہوتی ہے؟ اس میں اور جو قباحتیں ہوں سو ہوں اس کی بنیادیں ریت پر تعمیر کی گئی ہیں۔ جب ایک خوفزدہ حکمران ٹولہ اقتدار کی بقاء کیلئے فوج کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ جب ملک میں انتخابات کی کوئی جگہ نہ ہو مبادا کہ عوام حکمرانوں کو ہی بدل ڈالیں، جب سول اور فوجی انتظامیہ کا اعتماد اٹھ جائے اور لوگ انہیں اقتدار کے غاصب کہنے لگیں، تب ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اب ملک آخری دموں پر ہے "۔

طارق علی اپنے اس مضمون کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے

" زیر بحث موضوع پر اب ہم کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟ وہی پرانا سوال بار بار ذہن میں اٹھتا ہے۔ کیا پاکستان قائم رہ سکتا ہے؟ بعض وامانده اور مایوسی کے شکار لوگ تو اس سوال کا جواب نفی میں دے چکے ہیں اور کسی بیرونی مداخلت کے منتظر ہیں۔ یہ بھی

سچ ہے کہ ۱۹۷۱ء میں ملک کے دونیم ہو جانے سے مغربی پاکستان کے بیشتر عوام بہت دل برداشتہ ہوئے اور اکثراب کسی بھی ایسے ہی حادثے کیلئے نفسیاتی طور پر تیار ہیں۔ لیکن ایسے دل چھوڑنے والے لوگوں کو حوصلہ دینے کی ضرورت ہے۔ یہ زمانہ وہ نہیں جب ملک اتنی جلدی بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ جدید ریاستیں' خواہ وہ کتنی ہی کمزور اور پسماندہ کیوں نہ ہوں' اپنی پیشرو حکومتوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہیں۔ نظریاتی توڑ جوڑ' استبداد کے نت نئے حربے اور جدید تکنیکی مہارت کے امتزاج نے حکومتوں کو طاقتور بنادیا ہے۔ گو کہ ایسے نظام تیسری دنیا کے عوام کے حق میں ناخوشگوار اور نامساعد ثابت ہوئے ہیں۔ بہرطور پاکستان کو فوری طور پر ختم ہو جانے کا خطرہ نہیں۔ اس کی بنیادی ہل چکی ہیں لیکن اس کو وردی والے حکمرانوں نے تھام رکھا ہے اور وہ لوگ اپنا اقتدار قائم رکھنے کیلئے ہر خطرہ مول لینے کیلئے تیار ہیں۔

پاکستان کے طویل مستقبل کی ایک ہی صورت ہے کہ تمام معاشرہ سر سے پاؤں تک تبدیل ہو جائے اور اس کی از سرنو تشکیل ہو۔ لیکن کیا جرنیل' کیا ملّا اور کیا نوکر شاہی سب اسی خوف میں مبتلا ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ ان کی تمامتر کوششوں کے باوجود تاریخ کا فیصلہ اٹل ہے۔ بنگلہ دیش اور پھانسی دیا ہوا بھٹو ملک کے روایتی حکمرانوں کو ان کی خوابوں میں آ آ کر ڈراتے رہیں گے"۔

"پاکستان میں آمریت کی بنیادیں" نامی کتاب کے باب" آزاد پاکستان اور پاکستان کی معاشیات" کے مصنف جمیل رشید اور حسن گردیزی لکھتے ہیں۔

"اس وقت سوال یہ نہیں ہے کہ پاکستان موجودہ سیاسی اور معاشی بحران سے کیسے عہدہ بر آ ہو گا۔ اسوقت تو پاکستان کی سالمیت اور بقاہی ایک سوال بنی ہوئی ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ ملک میں مادی وسائل ہیں اور لوگ ذہین اور جفاکش بھی ہیں جن کے بل پر ملک خود کفیل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر پاکستان کو قائم رکھنا اور اس کی جغرافیائی سالمیت مقصود ہے تو لامحالہ صحیح جمہوریت اور بنیادی انسانی حقوق کی سمت قدم اٹھانا لازمی ہے۔ فوجی قوت میں اضافہ اور بیرونی امداد پر انحصار نہ تو پاکستان کو مضبوط بنا سکتے ہیں اور نہ ہی اس بات کی ضمانت دے سکتے ہیں کہ ماضی کی طرح یہی فوجی قوت عوام کے خلاف استعمال نہیں ہو گی۔ اپنے جغرافیائی محل وقوع اور فوجی حکمرانوں کی امریکی صدر ریگن کی سرد جنگ کی پالیسی سے وابستگی کے طفیل خطرہ ہے کہ پاکستان بڑی طاقتوں کی جنگ میں آ کر پس نہ جائے۔ ایسی صورت میں

پاکستان کی سرزمین غیر ملکی فوجوں کیلئے میدان جنگ بن سکتی ہے جس سے اس کی رہی سہی سالمیت پر آنچ آ سکتی ہے اور مزید ٹوٹ پھوٹ کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اگر فوجی حکومت اپنی موجودہ پالیسی پر قائم رہی تو ماسوائے ایک زبردست اندرونی انقلاب کے پاکستان کی بقاء کا اور کوئی چارہ نہیں"۔

طارق علی، جمیل رشید اور حسن گردیزی کی طرح اور لوگ بھی انہیں خطوط پر سوچنے پر مجبور ہیں۔ پاکستان اور بیرون ملک اکثر ذی شعور لوگ اسی نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بار بار مارشل لاء لگنا پاکستان کو ختم کر دیگا۔ جیسا کہ ۱۹۷۱ء کی ہند۔ پاک جنگ میں ہم ملک کے ٹوٹنے کا تماشہ دیکھ چکے ہیں۔ کسی انگریز تبصرہ نگار نے عرصہ ہوا پاکستان کے متعلق لکھا تھا کہ اس ملک کے تخیل کی بناء خوف تھی، اس کی پیدائش شدید اذیت میں ہوئی اور اسے کم عقلی نے کھو دیا۔ خاکم بدہن کہ کبھی ایسا ہو، لیکن اس خیال کی تردید کے لئے یہ کم عقلی کا دور اب ختم ہونا چاہئے پہلے ہی ہم بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ آدھا ملک، بیشتر سیاسی اور معاشرتی ادارے، سالمیت، عزت نفس، وقار، اخلاقی اقدار، کیا کیا نہیں کھویا۔

ان اوراق میں واقعات و مشاہدات کی روشنی میں رقم کی گئی بحث کا ایک حتمی نتیجہ جو میرے نزدیک واضح طور پر اخذ ہوتا ہے یہ ہے کہ مارشل لاء جس سے پاکستان دوچار رہا ہے، بنیادی طور پر عوام کے خلاف ایسی کارروائی ہے جس میں عوام کو قطعی طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور ان کی ہمہ قسم کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔ مارشل لاء ایک ایسا سڑکیں کوٹنے والا انجن ہے، جو ہر سامنے آنے والی چیز کو تہہ زمین دباتا چلا جاتا ہے اور اس طرح شہری آزادی، بنیادی حقوق، کھلا انصاف، سیاست، آزادیٔ گفتار و کردار اور حق اختلاف، عدالتی نظام، معاشرتی ادارے سب کے سب دب کر رفتہ رفتہ مر جاتے ہیں۔ معاشرہ گھٹ گھٹ کر بے حس ہو جاتا ہے۔

مارشل لاء انقلاب نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کا کوئی الگ یا منفرد فلسفہ ریاست ہے۔ یہ محض اقتدار غصب کرنے اور حکومت کرنے کا نام ہے۔ کیونکہ یہ طاقت کے بل پر آتا اور قائم رہتا ہے اور جس طاقت کا کوئی احتساب نہ ہو اس میں قباحتیں پیدا ہو جانی ایک فطری عمل ہے۔

بلاشبہ اس موضوع پر اور بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجھ سے زیادہ علم رکھنے والے ضرور قلم اٹھائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اپنی محدود اہلیت کے مطابق میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ لہٰذا ایک شعر کے ساتھ میں اپنے نوجوان دوستوں سے اجازت چاہوں گا۔

؎ ہے غارت چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ
شاخوں پر انگلیوں کے نشان دیکھتا ہوں میں



صدر پاکستان محمد ضیاء الحق

اختتامیہ

۳۰ دسمبر ۱۹۸۵ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے پاکستان سے مارشل لاء اٹھالیا اور دعویٰ کیا کہ وہ واحد ایسے حکمران ہیں جنہوں نے بغیر کسی اندرونی یا بیرونی دباؤ کے از خود ایسا کیا۔ انہوں نے مزید دعویٰ کیا کہ وہ بیس سال سے سلب شدہ بنیادی حقوق بھی بحال کر رہے ہیں۔ تین فوجی گورنر اپنے عہدوں سے سبکدوش ہو گئے۔ چوتھے نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے کر گورنری کے عہدے کو ترجیح دی۔

اس تاریخی واقعہ پر ظاہر ہے کہ بیشمار تبصرے ہوئے۔ یہاں ان میں چند اخباروں اور معروف ہستیوں کے تبصرے درج کرنا دلچسپی کا باعث ہو گا۔

جسٹس (ریٹائرڈ) فخرالدین جی ابراہیم نے روزنامہ ڈان کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

"اب کم از کم دوپہر کے وقت اندھیرا نہیں ہو گا۔ اگر سیاسی جماعتوں کو پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں ترامیم کے خلاف شکایت ہے تو وہ بنیادی حقوق کی بناء پر ان ترامیم کے خلاف قانونی چارہ جوئی کر سکتی ہیں. شکائتیں تو بہت ہیں

۱۹۷۳ء کے آئین میں بنیادی شقیں ترامیم کے ذریعے تبدیل کر دی گئی ہیں۔ ایک الٹاپلٹا ریفرنڈم عوام پر ٹھونس دیا گیا ہے۔ مزید بر آں قومی اسمبلی نے مارشل لاء کے دور کے تمام اقدامات پر توثیق کی مہر ثبت کر دی ہے. آرٹیکل اے ۲۷۰ کے تحت ان اقدامات کو کسی بناء پر بھی خواہ وہ بدنیتی پر مبنی ہوں یا اختیارات سے تجاوز پر، کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

یکم جنوری ۱۹۸۶ء نے قوم کی زندگی کے ایک طویل اور ناخوشگوار باب کا خاتمہ کیا۔ امید ہے کہ یکم جنوری ۱۹۸۷ء جماعتی انتخابات کا مژدہ لیکر آئیگی"۔

جسٹس ریٹائرڈ دراب پٹیل نے بھی ڈان اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا۔

"یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ساڑھے آٹھ سال کے مارشل لاء کے دوران جو قوانین واحکام نافذ ہوئے ان کو تسلیم کر کے ملک کے باقاعدہ قانون کا حصہ بنا دیا گیا PROVISIONAL CONSTITUTION ORDER پی۔ سی۔ او کا واحد مقصد یہی تھا کہ نصرت بھٹو کیس کے فیصلے کو منسوخ کر دیا جائے۔ کیونکہ اس فیصلے نے مارشل لاء حکومت اور خود چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے اختیارات پر کڑی پابندی لگادی تھی۔ چنانچہ جب جج صاحبان نے پی۔ سی۔ او کے تحت حلف اٹھالیا تو یہ فیصلہ منسوخ ہو گیا۔ "



جنرل محمد ضیاء الحق

مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی نے بھی اسی اخبار کو بیان دیتے ہوئے موجودہ حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے ۱۹۷۳ء کے آئین کو بے اثر بنا دیا ہے۔ پی۔ سی۔ او' آر۔ سی۔ او اور اس میں شامل ترامیم نے آئین کی ہیئت بدل کر رکھ دی ہے۔ چنانچہ اس ترمیم شدہ آئین میں جو اختیارات صدر کو تفویض کر دیئے گئے ہیں دنیا میں کسی اور صدر کو میسر نہیں ہیں۔

میر غوث بخش بزنجو نے کہا کہ "مارشل لاء کا اٹھنا غیر جماعتی اسمبلی کا کارنامہ نہیں ہے جیسا کہ صاحب صدر دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ جمہور کی مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے جس کو ایم آر ڈی نے صحیح قیادت سے پروان چڑھایا۔"

یہ بھی کہا کہ یہ عوام کے جذبہ خود اختیاری اور ارادوں کی پختگی کا مظہر ہے کہ مارشل لاء کو اٹھانا پڑا۔ جنرل ضیاء الحق کا یہ کہنا کہ نئی حکومت مارشل لاء کے دور کی اگلی کڑی ہے' مارشل لاء حکام کے ارادوں کی غمازی کرتا ہے۔ اسی غرض سے سیاسی عمل پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔ لیکن یاد رکھیں کہ اب عوام مارشل لاء کے کسی اثر کو قبول نہیں کریں گے۔

صدر ضیاء الحق نے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ اپنے پاس رکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے فوج ابھی تک سیاست پر اپنا سایہ رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آج گذشتہ کل کی طرح نہیں رہے گی اور حالات تبدیل ہو کر ہی رہیں گے"۔

فیڈرل شریعت کورٹ کے سابق جج شیخ آفتاب حسین نے کہا کہ صدر کا فوج کی کمان سنبھالے رکھنا اس بات کا مظہر ہے کہ ملک سے مارشل لاء ابھی نہیں اٹھایا گیا۔

"ریٹائرڈ جسٹس شیخ شوکت علی نے نئی حکومت کو سول اور فوجی اشتراک کا نام دیا ہے۔"

روزنامہ ڈان نے نیویارک ٹائمز اخبار کے حوالے سے لکھا کہ صدر ضیاء الحق نے چیف آف آرمی سٹاف کا عہدہ اپنے پاس رکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ فوج ابھی تک اقتدار پر قبضہ رکھتی ہے۔ یہ فیصلہ اس بات کی غمازی بھی کرتا ہے کہ صدر کو یقین نہیں کہ صدارت انہیں اختیارات کی ضمانت دیتی ہے۔ نیویارک ٹائمز کا کہنا ہے کہ دوسری وجہ بھی سنی جاتی ہے کہ صدر کو فوج پر تسلط رکھنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ کہیں کوئی دوسرا جرنیل ضیاء الحق کی حکومت کا تختہ ہی نہ الٹ دے۔

"مزید کہا کہ گو سینکڑوں سیاسی قیدی پاکستان کی جیلوں میں ہیں اور ظلم اور اذیت



بے نظیر بھٹو

دہی کاشتکار ہیں لیکن عام طور پر ملک میں حالات بہتر ہیں اور دو سال پہلے کی استبداد اب نہیں ہے۔"

روزنامہ ڈان نے واشنگٹن پوسٹ کے حوالے سے لکھا کہ

"موجودہ معاشی اور سیاسی دباؤ کے تحت مارشل لاء کا اٹھانا اور سول حکومت کا بحال کرنا ناگزیر تھا پاکستانی اور غیر ملکی مبصر سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے نو کروڑ عوام کی طرز زندگی میں فی الحال کوئی تبدیلی نہیں آئیگی۔ لیکن اکثر مبصرین نے جنرل ضیاء الحق کے اقدام کو سراہا ہے کہ یہ جمہوریت کی منزل کی طرف ایک قدم ہے۔ البتہ سول حکومت بحال کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اس سے ملک میں مزید آئینی بحران پیدا ہو گیا ہے۔ اب بھی مارشل لاء کے عہد کے احکام و قوانین جاری رہیں گے۔ جن کی مدد سے ضیاء الحق ملک پر حکومت کرتے رہیں گے۔

بیرون ملک مزدوری کرنے والے لاکھوں پاکستانی واپس آ رہے ہیں اور یہاں ان کو بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تیس لاکھ افغان مہاجرین کی کفالت کا بوجھ بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ مہاجرین نے ملک بھر میں سمگل شدہ اسلحہ پھیلا دیا ہے۔ روائتی علاقائی کشمکش بھی جاری ہے۔ ان حالات میں ملک کی سالمیت اور استحکام یقیناً خطرے میں ہیں"۔

شمالی علاقوں میں افغان مہاجرین نے ایک بحران کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے جس کا اثر دور دور تک محسوس ہو رہا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۶ء میں اور اس کے بعد پے در پے کراچی میں لسانی اور علاقائی تعصب کی بناء پر ہولناک ہنگامے ہوتے رہے جن میں اسلحہ کا بے دریغ استعمال ہوا اور بہت سی جانوں کا ضیاع ہوا۔ یہ اسلحہ افغان مہاجرین کا سمگل کیا ہوا ہے۔ لاہور میں بھی مذہبی بناء پر کشت و خون ہوا۔ علاقائی 'مذہبی' فرقہ وارانہ اختلافات کی بناء پر تخریبی جنگ و جدل کا اتنا دور دورہ رہا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے مشرقی پاکستان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ معاشرے میں دھڑے بندی غیر جماعتی انتخابات کی وجہ سے بھی ابھری ہے۔
روزنامہ جنگ میں لکھتے ہوئے واجد شمس الحسن نے کہا۔

ہماری مختصر سی تاریخ میں مارشل لاء کے طویل ترین دور نے ہمارے سماجی 'معاشی اور سیاسی وجود پر تباہ کن اثرات چھوڑے ہیں۔ لوگوں کی سیاسی سوچ اور آزادی کو کچل دیا ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی پر بھی غیر معمولی چھاپ لگا دی ہے۔ اور ہر طرح سے ہمیں لخت لخت کر کے رکھ دیا ہے۔ نہ صرف طبقاتی تفریق موجود ہے بلکہ مذہبی منافرت اور گروہ بندی کا خطرہ بھی لاحق ہے۔ کوئی طبقہ دوسرے طبقے کو برداشت

کرنے کیلئے تیار نہیں ہے۔

یہ امر ناقابل تردید ہے کہ سندھ میں ایک عرصہ سے ملکی استحکام کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ جب فوج نے سندھ میں باغیانہ کارروائیوں کے خلاف طویل مہم چلائی تو باوجود چار پانچ سو جانوں کے ضیاع کے سندھی نوجوانوں کے خیالات نہیں بدلے سڑکوں اور ریل پر ڈاکے 'اغوا اور پولیس اسٹیشنوں پر حملے بدستور جاری رہے۔ ان جرائم کے ملزم زمانہ قدیم کے روایتی ڈاکو نہیں ہیں بلکہ سندھ کا وہ نوجوان طبقہ ہے جو جی ایم سید کی علیحدہ سندھو دیش کی رٹ 'ممتاز علی بھٹو اور عبدالحفیظ پیرزادہ کے نعرہ کنفیڈریشن سے متاثر ہو کر ملک کی فوجی اور سول دونوں انتظامیہ سے بیزار ہو چکا ہے اور شکایتوں کا ایک طوفان سینوں میں لئے جرائم کی زبان سے اظہار اختلاف کر رہا ہے۔

ہماری نو سالہ افغان پالیسی جس پر خالص امریکی چھاپ لگی ہوئی ہے ' اب رنگ لا رہی ہے جبکہ امریکہ اور روس میں افغانستان کے متعلق بالا بالا تصفیہ ہو گیا ہے۔ ہمیں نو سال متواتر اس انتہائی خطرناک گورکھ دھندے میں مبتلا کر کے امریکہ نے تصفیہ کرتے وقت ہمیں رسمی مشورے کیلئے بھی در خور اعتنا نہیں سمجھا اور اب ہمارے وزیر اعظم فیصلے کی ذمہ داری کو بانٹنے کیلئے سیاسی جماعتوں سے مذاکرات کر رہے ہیں۔ اگر روسی فوجیں واپس چلی جاتی ہیں اور افغان مہاجرین کیلئے کابل حکومت میں کوئی گوشہ فراہم نہیں ہوتا تو پاکستان میں ایک تباہ کن صورت حالات پیدا ہو سکتی ہے۔

بہر طور ملک میں یک جہتی کی طرف پہلا قدم وزیر اعظم نے سیاسی لیڈروں کی گول میز کانفرنس کے ذریعے اٹھایا۔ جس کا خیر مقدم ملک بھر میں ہوا۔ یہی سیاست ہے جسے مارشل لاء حکام ملک بدر کرنے پر تلے رہتے ہیں۔

انتظامیہ میں بد دیانتی اور رشوت ستانی بدرجہ اتم پہنچی ہوئی ہے اور خود صدر نے بار بار اس کا اعتراف کیا ہے۔ جنرل مجید نے جو اسمبلی کی مقررہ کردہ انسداد رشوت ستانی کمیٹی کا صدر ہے بہت سے جرائم کا انکشاف کیا ہے۔ حال ہی میں اخبارات میں مسٹر گوکل کا سکینڈل نکلا جب گوکل مارشل لاء حکومت کا جہاز رانی کا مشیر خاص تھا تو امریکہ سے پاکستان گندم کی درآمد میں اس مشیر باتدبیر نے مارکیٹ ریٹ سے ۲۰ لاکھ ڈالرز زیادہ لے لئے۔ یہ اس وقت کی وزارت کی ایماء سے ہوا۔ تیس برس پہلے ایک کروڑ روپے کا سونا پاکستان سے ہندوستان سمگل کرنے کی کوشش ناکام بنادی گئی اور کسٹم کے محکمے نے سونا بحق سرکار ضبط کر لیا۔ یہ سونا سیٹھ عابد کا تھا۔ حال ہی میں یہ سونا سیٹھ عابد کو واپس کر دیا گیا۔ جنرل مجید نے ابھی تک اس دو کروڑ روپے کی نقدی اور گھڑیوں کا سراغ نہیں لگایا جو سیٹھ عابد سے بھٹو کے زمانے میں ضبط کیا گیا تھا اور مارشل لاء کی حکومت کے حکم سے واپس کر دیا گیا تھا۔

یہ بھی کہا جارہا ہے کہ بعض افسران بالا نے اپنے لئے امریکہ اور یورپ میں محلات اور بڑے بڑے زرعی فارم خرید رکھے ہیں اور بعض کیلئے تو پاکستان سے بذریعہ ہوائی جہاز گھوڑے بھی لے جائے گئے ہیں۔ جنرل مجید کمیٹی یقیناً ان الزامات کی تحقیق بھی کریگی۔

رشوت ستانی اور بد دیانتی ملک میں اس طرح پھیل گئی ہے کہ اس کا انسداد ماسوائے نہایت کڑے انقلابی قسم کے اقدامات کے ممکن نہیں۔ اس روگ کو بھی مارشل لاء کے طویل عہد میں فروغ حاصل ہوا ہے۔

اپنے ایک غیر ملکی دورے کے دوران صدر ضیاء الحق نے کہا کہ مس بے نظیر بھٹو ایک ذہین لیکن گمراہ نوجوان لڑکی ہے۔ نظربندی سے آزاد ہو کر اس گمراہ لڑکی نے چیلنج کیا کہ وہ صدر کے خلاف براہ راست الیکشن لڑنے کیلئے تیار ہے۔ صدر نے یہ کہہ کر بات کو ٹال دیا کہ وہ خواتین کا بہت احترام کرتے ہیں اور کسی خاتون کے خلاف الیکشن لڑنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے۔ بہرطور جب بے نظیر بھٹو ۱۹۸۶ء میں پاکستان واپس آئی تو ملک بھر میں ہر جگہ اس کا والہانہ استقبال ہوا اور بعض جگہوں پر تو جلسے جلوسوں نے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے۔ لیکن صدر کیلئے یہ سب کچھ بے معنی ہے کیونکہ آئین انتظامیہ اور فوج ان کے ہاتھ میں ہیں۔

لہٰذا مارشل لاء کی وباء کے پے در پے حملوں سے واماندہ پاکستان کسی نہ کسی طور پر چل رہا ہے۔ اس کی سیاست ' ادرے خستہ حال ' اس کی خارجہ پالیسی خودکشی کے مترادف اس پر قرضوں کا ناقابل برداشت بوجھ اور اس کی جمہوریت پر فوج کا آسیب سوار ہے۔

ے خزاں تمام ہوئی کس حساب میں لکھئے
بہارِ گُل میں جو پہنچی ہے شاخِ گُل کو گزند

سٹاپ پریس

پاکستان میں سیاست ہمہ وقت نئے سے نئے روپ دکھاتی رہتی ہے۔ وزیر اعظم محمد خان جونیجو عوامی جمہوریہ چین کے کامیاب دورے سے واپس وطن لوٹے ہی تھے۔ کہ جناب صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے قومی اسمبلی اور جونیجو کابینہ دونوں کو برطرف کر دیا۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو یہ حکم نافذ ہوا۔ اگلے دن صوبائی اسمبلیاں اور کابینہ بھی برطرف کر دیئے گئے۔ فقط وفاقی سینیٹ جس کے سربراہ مسٹر غلام اسحاق ہیں بدستور برقرار ہے۔

اس ناخوشگوار حکم کی وجوہات جو صاحب صدر کے بیان سے معلوم ہوئی ہیں وہ ہیں رشوت کی بڑھتی ہوئی گرم بازاری، امن عامہ میں روزبروز کا خلل اور ملک میں نفاذ اسلام میں کوتاہی۔ ان وجوہات پر بحث سے پیشتر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ صدر صاحب نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ وفاق اور صوبوں میں عبوری حکومتیں قائم کی جائیں گی۔ صوبہ سرحد میں سابق گورنر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور موجودہ سینیٹر، لیفٹیننٹ جنرل فضل حق صاحب کو وزیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا ہے۔ پنجاب میں موجودہ وزیر اعلیٰ میاں محمد نواز شریف ہی قائم مقام سربراہ انتظامیہ کے فرائض ادا کریں گے۔ صوبائی مسلم لیگ کے صدر ہونے کی حیثیت سے نواز شریف صاحب کی یہ تقرری محل نظر ہے جبکہ اسی پارٹی کی وفاقی اور صوبائی حکومتیں معزول ہو چکی ہیں۔ بلوچستان اور سندھ میں تادم تحریر کوئی قائم مقام وزیر اعلیٰ مقرر نہیں ہوئے۔ اور فی الحال وفاقی کابینہ کا اعلان ہوا ہے۔ پرانے ہمسفر یعنی جماعت اسلامی کے نئے سربراہ چونکہ صاحب صدر کے ہم خیال نہیں ہیں لہٰذا اب صدر صاحب پیر صاحب پگاڑا ہی کی حمایت پر تکیہ کئے ہوئے ہیں اور توقع یہی کی جاتی تھی کہ اب حکومتوں کی تشکیل پیر صاحب کے مشورے سے ہی ہوگی۔ صدر صاحب نے پیر صاحب سے مشورہ تو کیا لیکن جو وزارت بنائی اس میں آٹھ وزرا جونیجو صاحب کی معزول شدہ وزارت سے اور دس وزرا دیگر لئے گئے جن میں دو حضرات ایسے بھی ہیں جو جی۔ ایم۔ سید کی متنازعہ سن کانفرنس میں بھی شریک تھے۔ وزیر اعظم کسی کو نہیں بنایا یہ عہدہ صدر کے پاس ہی رہے گا۔

صدر نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ وفاق اور صوبوں میں نوے دن کے اندر نئے الیکشن ہوں گے۔ آئینی ماہرین کی متفقہ رائے ہے کہ اس پروگرام میں تبدیلی ممکن نہیں۔ لہٰذا اگر صدر اس پروگرام میں تبدیلی لانا چاہیں تو انہیں آئین کی خلاف ورزی کرنا ہوگی۔ پرانے وعدوں کو یاد کر کے ملک میں اکثر اکابرین تشکیک کا شکار ہیں اور کہتے ہیں کہ صدر کوئی نہ کوئی حیلہ کر کے الیکشن ملتوی کرنے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ الیکشن شاید ان کے مفاد کے مطابق نہ ہوں۔

جونیجو حکومت صدر ضیاء الحق کی اپنی ہی تخلیق کردہ حکومت تھی۔ انھوں نے وزیر اعظم بڑے غور وخوض کے بعد نامزد کیا۔ اسمبلی بھی غیر جماعتی بنائی تاکہ دونوں، یعنی وزیر اعظم اور اسمبلی، کمزور رہیں اور دونوں میں سے کسی میں بھی صدر کی اتھارٹی کے خلاف کوئی اقدام کرنے کی سکت نہ ہو۔ یہی نہیں، جیسا کہ اس کتاب میں پہلے کہا جا چکا ہے، اسمبلی کی پہلی نشست سے دو ہفتے قبل انھوں نے آرڈیننس کے ذریعے آئین میں دوررس ترامیم کرکے اسمبلی کے مقابلے میں اپنی پوزیشن اتنی مضبوط کرلی کہ تمام تر انتظامی امور پر ان کا حکم حرف آخر ہو گیا حتیٰ کہ انھوں نے اپنے آپ کو عدلیہ سے بھی بالاتر کرلیا۔ اس مضمون پر کتاب کے ایک دوسرے حصے میں سیر حاصل بحث کی جا چکی ہے۔ جونیجو حکومت تو محض روزمرہ کے انتظامی امور میں ہی منہمک تھی، قومی اور بین الاقوامی مسائل مثلاً خارجہ پالیسی، دفاع اور نیشنل سیکورٹی، جس میں انٹیلی جنس، جوہری توانائی اور دیگر نازک اور اہم امور شامل ہیں، ان سب پر صدر ضیاء قادر مطلق تھے۔ البتہ حال ہی میں وزیر اعظم کو چند ایسے معاملات میں پیش رفت کی ضرورت پڑی جن میں وہ صدر ضیاء کی توقعات پر پورے نہ اتر سکے۔

مشاہد حسین نے اپنے ایک حالیہ تبصرے میں جو روزنامہ "نیشن" کے ۴ جون کے شمارے میں شائع ہوا ان واقعات کی تفصیل یوں بیان کی ہے۔

نومبر ۱۹۸۸ء

جنرل ضیاء الحق کی مرضی کے خلاف صاحبزادہ یعقوب علی خان کو وزارت خارجہ سے الگ کر دیا گیا۔ غیر سرکاری طور پر ہدایت جاری کی گئی کہ وزارت خارجہ کی فائلیں صدر صاحب کو نہ بھیجی جائیں۔ اس طرح صدر کو وزارت خارجہ کے معاملات میں دخل عمل نہ رہا۔

۲۵ جنوری ۱۹۸۸ء

واشنگٹن پوسٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے اعلان کر دیا کہ پاکستان نجیب حکومت (افغانستان) کے ساتھ کسی معاہدے پر دستخط نہیں کرے گا۔ چنانچہ یہ سرکاری پالیسی کا تعین ہو گیا اور صدر ضیاء الحق نے افغان پالیسی پر مکمل اور حتمی اختیار کا فیصلہ واضح کر دیا۔

فروری ۱۹۸۸ء

گورباچوف نے اعلان کر دیا کہ اگر ۱۵ مارچ تک جنیوا سمجھوتے پر دستخط ہو جاتے ہیں تو روسی فوجیں ۱۵ مئی سے واپس جانا شروع کر دیں گی۔ اس پر صدر ضیاء الحق نے یہ موقف اختیار کیا کہ اصل مسئلہ روسی فوج کے انخلاء کا نہیں بلکہ کابل

میں عبوری حکومت کے قیام کا ہے۔ ۲۷ فروری کو وزیر اعظم جونیجو اور ان کے رفقاء کے ساتھ ایک طویل گفتگو میں صدر نے وزیر خارجہ زین نورانی کو تنبیہ کی کہ اگر تم نے جنیوا میں کسی سمجھوتے پر دستخط کئے تو عوام تمہیں سرعام تختہ دار پر لٹکا دیں گے۔

یکم فروری

صدر ضیاء الحق نے لاہور میں تقریر کرتے ہوئے اپنے ہی تخلیق کردہ نظام پر سخت تنقید کی

مارچ ۱۹۸۸ء

وزیر اعظم جونیجو نے مسئلہ افغانستان پر ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں پر مشتمل گول میز کانفرنس منعقد کی۔ جس کو صدر نے اپنے خلاف ایک براہ راست اقدام سمجھا۔

مارچ ۱۹۸۸ء

پارلیمینٹ کو خلاف کرتے ہوئے صدر ضیاء نے انتظامیہ پر نہایت کڑی تنقید کی اور اس پر رشوت خوری اور نفاذ اسلام میں کوتاہی کا الزام لگایا۔

اپریل ۱۹۸۸ء

اوجڑی کیمپ میں دھماکے ہونے پر ایک نہایت نازک اور مخفی معاملات کے باب کے انکشاف کا سلسلہ چل نکلا جس میں فوج' امریکی رابطہ اور افغان پالیسی جیسے حساس' خفیہ اور حکومت کے نقطہ نظر سے خطرناک پہلو عوام کے سامنے افشا ہونے لگے انتظامیہ کے بعض ارکان انٹر سروسز انٹیلی جنس کو مورد الزام ٹھہرانے پر مصر تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ چند سربراہان اس کوتاہی کے جرم میں ملازمت سے سبکدوش کر دئے جائیں۔

مئی ۱۹۸۸ء

اوجڑی کیمپ کے دھماکے کی وجہ سے علاقے میں تباہی سے فوج پر تنقید اور فوج کے بجٹ میں تخفیف کی باتیں شروع ہو گئیں۔ چوہڑ ہڑپال میں ایک ممبر صوبائی اسمبلی اور ایک فوجی کے درمیان جھڑپ نازک صورت اختیار کر گئی جس میں ایک فوجی گاڑی جلا دی گئی۔

مئی ۱۹۸۸ء

ایک کتاب کی رونمائی کے سلسلے میں صدر ضیاء الحق نے تقریر کرتے ہوئے

فوجی بجٹ میں تخفیف پر کڑی نکتہ چینی کی۔

مئی ۱۹۸۸ء

نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے صدر ضیاء نے رانا نعیم محمود، منسٹر آف سٹیٹ ڈیفنس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ فوج کو حمایت کرنے والوں کی ضرورت ہے نہ مخالفین کی۔ یہ بات انھوں نے اوجڑی کیمپ کے دھماکے کے متعلق کیبنٹ کی ریویو کمیٹی کے حوالے سے کہی جو دھماکے کی ذمہ داری کا تعین کرنے میں مصروف تھی۔

جناب مشاہد حسین کے مندرجہ بالا تجزیے سے، جو یقیناً قرین قیاس ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ جنیوا سمجھوتا، اوجڑی کیمپ میں اسلحہ بارود رکھنے کے ذمہ دار انٹر سروسز کے ڈائریکٹر جنرل کی برخاستگی کا امکان، چوہڑ ہرپال، راولپنڈی میں ایک ممبر صوبائی اسمبلی اور چند فوجیوں کے درمیان لڑائی وغیرہ ایسے واقعات تھے جو صدر ضیاء الحق کے ۲۹ مئی کے اقدام کے محرک تھے۔ یہ افواہ کہ ڈیفنس بجٹ میں کٹوتی ہو سکتی ہے، بھی ایک ایسا خطرہ تھا جو جنرل صاحب ہر حال میں دور کرنا مناسب سمجھتے ہوں گے۔

ڈیفنس بجٹ کا ذکر آ گیا تو کہتا چلوں کہ ماہرین اقتصادیات کے کہنے کے مطابق ملک تیزی سے ایک معاشی بحران کی طرف بڑھ رہا ہے۔ حکومت کچھ بھی کہے لیکن INFLACTION ۳۰ فیصد سے زیادہ ہے اور بتدریج بڑھ رہی ہے۔ ڈیفنس اور قرضوں کی ادائیگی مل کر بجٹ کا ۶۰ فی صد سے زائد حصہ لے جاتے ہیں۔ مزید قرضہ جات جو ترقیاتی پروگراموں کے نام پر لئے جاتے ہیں، بیشتر اس مد میں خرچ ہو جاتے ہیں۔ اس پر حکومت بالواسطہ ٹیکس لگانے پر تلی ہوئی ہے۔ جو ۸۲ فیصد تک پہنچتے ہیں اور جن کا تمامتر بوجھ غریب عوام پر پڑتا ہے۔ براہ راست ۱۸ فیصد ٹیکس جو امیر طبقہ ادا کرنے کا احسان کرتا ہے، ان کے اصل ٹیکس کا عشر عشیر بھی نہیں جو در اصل ان پر واجب آتا ہے۔ لہٰذا امیر طبقہ حکومت کی اعانت سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے اور غریب عوام بالواسطہ ٹیکسوں کی بدولت غربت میں پس رہے ہیں۔ البتہ نوکر شاہی ہر طرح سے آسودہ ہے۔

اب آیئے ان الزامات کی طرف جو صاحب صدر نے اپنے ۲۹ مئی کے اعلان کی وجوہات قرار دیئے ہیں۔ سب سے پہلے بڑھتی ہوئی رشوت ستانی کو لیجئے۔ جیسا کہ اس کتاب کے ایک دوسرے حصے میں عرض کیا جا چکا ہے صدر اپنے نو سالہ مارشل لاء کے دوران کئی مرتبہ خود فرما چکے ہیں کہ رشوت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ اب میں ائر مارشل (ریٹائرڈ) نور خان، سابق ممبر نیشنل اسمبلی کے ایک حالیہ بیان جو انھوں نے روزنامہ "نیشن" کو دیا اور ۷ جون ۱۹۸۸ء کو چھپا، میں سے مندرجہ ذیل اقتباس درج ذیل کرتا ہوں۔

انہوں نے (نور خان) نے صدر کے ممبران اسمبلی پر عائد کردہ الزام سے سخت الفاظ میں اختلاف کا اظہار کیا اور کہا کہ ۱۹۸۵ء سے پہلے کی مارشل لاء حکومت ہی دراصل رشوت کی بدعنوانی کی محرک تھی اور یہ زہر اسی حکومت نے معاشرے میں پھیلایا۔ انہوں نے مزید کہا کہ دیگر تمام الزامات کے لئے بھی جو ممبرانِ اسمبلی کے خلاف لگائے ہیں دراصل صاحب صدر خود ذمہ دار ہیں مزید کہا کہ خود صدر نے صوبہ سرحد میں ایک ایسے شخص کو پھر سے تعینات کیا ہے جس نے مارشل لاء لاء حکومت میں اپنے عہد کے دوران منشیات اور جدید اسلحہ کے کاروبار کو اس نہایت حساس علاقے میں فروغ دیا۔"

ایک اور بات کا ذکر بھی قارئین کے لئے باعث دلچسپی ہوگا۔ سننے میں آیا ہے کہ ۱۹۸۱ء میں مارشل لاء حکومت نے جسٹس شفیع الرحمان، جج سپریم کورٹ کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا تھا۔ کہ وہ رشوت اور بدعنوانی کی نشاندہی کرے اور معاشرے کو ان لعنتوں سے پاک کرنے کی سفارشات پیش کرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کمیشن نے ایک سال کام کرنے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی جو آج تک نہ تو عوام کے سامنے آئی ہے اور نہ ہی اس پر کوئی عمل درآمد ہوا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو ائر مارشل نور خان کے مندرجہ بالا سخت الفاظ کی کسی قدر تائید ہو جاتی ہے۔

جہاں تک امن عامہ کا تعلق ہے ہم اس مضمون پر کسی قدر مفصل بحث کر چکے ہیں۔ کراچی کی صورت حال اور اندرون سندھ میں جرائم کی بہتات دراصل سیاسی اختلاف کی ایک صورت ہے۔ جو مارشل لاء کی طوالت اور اس کے بعد ایک ایسی سول حکومت کی تشکیل کے خلاف احتجاج ہے جو درحقیقت بے دست و پا تھی۔ اس حکومت کی بیچارگی کا باعث آئین میں ترامیم تھیں۔ جو صدر نے یک طرفہ اور یک قلم اسمبلی کی پہلی نشست سے قبل ہی کر دی تھی اور جن کی توثیق اسی اسمبلی نے کی۔ علیحدگی پسندی، خصوصاً سندھ میں سندھو دیش کی تحریک انہیں خطوط پر جن پر بنگلہ دیش کی تحریک چلی تھی۔ کنفیڈریشن کی تحریک اور بلوچستان میں بزنجو صاحب کی یہ تحریک کہ آئین میں یہ شق رکھی جائے اور اگر ملک میں پھر کبھی مارشل لاء لگے تو ہر صوبے کو علیحدگی کا اختیار ہونا چاہئے۔ یہ سب تحاریک صرف اور صرف مارشل لاء کی پیداوار ہیں۔ منشیات اور اسلحہ کی فراوانی افغان مہاجرین کا عطیہ ہے۔ لہٰذا امن عامہ میں خلل کا ذمہ دار جونیجو حکومت کو ٹھہرانا دل لگتی بات نہیں۔

آخر میں نفاذ اسلام میں کوتاہی کا الزام ہے۔ صاحب صدر نے نیشنل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے اس بات پر ممبران پر بہت کڑی تنقید کی تھی کہ شریعت بل ابھی تک جوں کا توں پڑا ہوا ہے اور ممبران دیگر مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ شریعت بل کیا ہے۔ یہ کلیتہً عوام کو معلوم نہیں ہو سکا کیونکہ اس کی

کوئی مفصل تشہیر نہیں کی گئی۔ البتہ جن حضرات نے کوشش کر کے اس کی تفصیلات معلوم کی ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس سے قوم میں مزید اختلافات پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ نفاذ زکوٰۃ پر بھی قوم میں تفرقہ پڑ گیا تھا۔ اور خدا جانتا ہے کہ یہ ملک کسی مزید تفرقے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ماہرین کی یہ بھی رائے ہے کہ یہ بل جمہوریت کے منافی ہے۔ علاوہ بریں قومی اسمبلی میں یہ بل پیش ہو چکا ہے۔ اسمبلی عوام کی نمائندہ ہے یا تھی اگر عوام کے نمائندگان اس بل پر اعتراض رکھتے ہیں یا مزید غور و خوض کے لئے اسے التوا میں رکھنا چاہتے ہیں تو صاحب صدر اس قدر تیز رفتاری پر کیوں مصر ہیں؟ ہم نے تو یہی سنا تھا کہ عوام کی رائے خدا کی آواز ہوتی ہے۔ اگر عوام کو آزادی رائے دے ہی دی ہے۔ تو انہیں اس آزادی کو استعمال کرنے کا موقع دیں۔ اس کے برعکس اگر عوام کے نمائندوں نے صرف حکم ہی بجا لانے ہیں تو یہ اسمبلیاں مثالی ربڑ کی مہریں ثابت ہوں گی۔ اسلام میں ریاست کا تصوّر ایک طویل اور بحث طلب مضمون ہے لیکن اصول صرف یہ ہیں۔ مکمل مساوات، قانون کی بالادستی، نمائندہ حکومت اور حاکم کی عوام کے سامنے جوابدہی۔ اگر شریعت بل قانون کو حاکم و محکوم دونوں پر بالادستی عطا کرتا ہے، دونوں کو مساوی مراعات و تعزیرات کا پابند بناتا ہے، حاکم کو ہر طرح اور ہمہ وقت عوام کے سامنے جوابدہ بناتا ہے اور زبان خلق کو نقارہ خدا کا درجہ دیتا ہے تو یقیناً یہ اسلام کے اصولوں کے مطابق ہوگا۔ لیکن اگر عوام اور ان کے نمائندے کٹھ پتلی بن کر رہ جائیں گے۔ اگر حاکم قانون کی زد سے بری ہوں گے، اگر غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہوتے جائیں گے۔ تو شاید یہ شریعت بل عوام کی سمجھ میں نہ آسکے گا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے صاحب صدر نے الیکشن کے بعد اور اسمبلی کی نشست سے پہلے جو پچاس سے زائد ترامیم آئین میں فرما دیں ان میں تو اسلام کے نفاذ کی کوئی شق نظر نہیں آتی ماسوائے قرارداد مقاصد کے جو ۱۹۵۶ء کے آئین سے لیا گیا ہے۔ بقیہ سب کی سب صدر کو اقتدار کل عطا کرتی ہیں۔ (تاہم صدر نے اسے ۱۵ جون کو ایک آرڈیننس کے ذریعے نافذ کر دیا ہے)

اس بات میں وزن معلوم ہوتا ہے کہ صاحب صدر کے ۲۹ مئی کے اقدام کے پیچھے کچھ اور وجوہات بھی ہیں علاوہ ان وجوہات کے جن کی انہوں نے اعلان کیا اور جن پر مندرجہ بالا سطور میں ادنیٰ سے تبصرے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تحت الشعور وجوہات میں سے شاید ایک یہ مسلسل مطالبہ بھی ہے جو عوام اور ان کے نمائندے اور ملک کے تمام دانشور کر رہے ہیں کہ صاحب صدر فوج کی سربراہی سے سبکدوش ہو جائیں۔ ۵ جون ۱۹۸۸ء کے روزنامہ ”نیشن“ میں ریٹائرڈ لیفٹننٹ جنرل محمد اعظم خان کے نام سے ایک مضمون چھپا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

”ضیا فوج کو ایک سیاسی جماعت بنا رہے ہیں“

سابق گورنر مشرقی پاکستان، لیفٹننٹ جنرل محمد اعظم خان نے الزام عائد کیا ہے کہ روز اول سے ہی صدر جنرل ضیاء الحق سیاسی اقتدار کے خواہاں تھے اور انہوں نے اپنے اس مقصد کے حصول کے

لئے فوج کو ایک سیاسی جماعت میں تبدیل کر دیا ہے۔

صدر کے نام ایک کھلے خط میں جو الزامات کی ایک طویل فہرست ہے انہوں نے کہا ہے کہ اوجڑی کیمپ کے دھماکوں کے ذمہ داروں کو دنیا کے کسی کونے میں پناہ نہیں مل سکتی جس سرعت سے تمام شہادت کو چھپا دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس سانحہ کے ذمہ داروں کو بھی (پس نقاب رکھا گیا ہے) اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ صدر اس واقعہ کو دبا دینے کے لئے کتنے بے چین تھے۔

جنرل اعظم کا کہنا ہے کہ صدر کا اپنے ہی تخلیق کردہ نظام ریاست کو مٹا دینے کا اقدام ان کی بیقراری کا مظہر ہے۔ کاش آپ نے (یعنی صدر نے) اتنی ہی گرمجوشی سے سیاچن گلیشیر کا دفاع کیا ہوتا!

پاکستانی معاشرے کے دور حاضر کے ناموافق حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ پاکستان میں طویل ترین مارشل لاء اور صدر ضیاء الحق کی آمرانہ حکومت نے معاشرے کا شیرازہ درہم برہم کر دیا ہے۔ چادر اور چار دیواری کے تقدّس کا نعرہ عوام کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتا کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ خود قانون نافذ کرنے والے ادارے سب سے بڑے قانون شکن ہیں۔

جنرل اعظم نے مزید کہا کہ چیف آف سٹاف کا عہدہ نہ چھوڑنے سے صدر ضیا نے کم از کم دس نہایت قابل جرنیلوں کی ترقی کا راستہ مسدود کر دیا ہے۔ جنرل اعظم نے یہ الزام بھی لگایا کہ صدر نے دانستہ طور پر سیاسی جماعتوں میں اختلاف اور انتشار کو ہوا دی ہے۔ اس حکمت عملی کا مقصد محض اپنے ذاتی اقتدار کو برقرار رکھنا ہے۔

جنرل اعظم پوچھتے ہیں کہ صدر ضیاء کو (عوام میں سے) کس نے یہ اختیار دیا تھا کہ وہ پاکستان کو افغان جنگ میں ملوث کریں؟ اس جنگ میں ملوث ہو کر آج پاکستان کو بیشمار مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ہزارہا پاکستانی دھماکوں کی وجہ سے جان سے گئے یا معذور بنا دئے گئے۔ کلاشن کوف اور منشیات کی لعنت بھی جنرل ضیاء کے اقدام کا ایک شاخسانہ ہے۔

جنرل اعظم نے الزام لگایا کہ صدر کا اپنے آپ کو اسلام کا داعی کہنا ایک قسم کی منافقت ہے۔ انھوں نے کہا کہ بہتر ہوگا کہ اب صدر ضیاء الحق اپنے آپ کو فیلڈ مارشل لاء بنانے کی کوشش نہ کریں کیونکہ ملک آخری فیلڈ مارشل (اور اس کے حشر

کو) عرصہ ہوا دیکھ چکا ہے۔
آخر میں جنرل اعظم کا کہنا ہے کہ اب صدر ضیاء الحق بالکل اکیلے ہیں اور تمام ملک ان کے خلاف سمت جا رہا ہے۔

چالیس لاکھ افغان مہاجرین باوجود جنیوا سمجھوتے کے افغانستان واپس جانے پر آمادہ نہیں ہو رہے۔ سمجھوتے میں مہاجرین کی امداد اور ان کو پناہ دینے پر کڑی پابندی ہے۔ اگر یہ امداد اعلانیہ یا خفیہ طور پر جاری رہتی ہے اور روسی فوجوں کے انخلاء پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تو روسی انتقامی کارروائی کر سکتے ہیں جس کا تصور بھی دل ہلا دیتا ہے۔ گورباچوف نے اس معاملے میں اپنی پالیسی کا واشگاف الفاظ میں اظہار کر دیا ہوا ہے۔ اگر اس کے برعکس امداد بند کر دی جاتی ہے تو افغان مہاجرین پاکستان میں رہ کر جو تباہ کاری کر سکتے ہیں وہ بھی اپنی جگہ ایک الگ حشر ہوگا۔

حسب معمول اپنے دلیرانہ تبصرے میں ارشاد احمد حقانی صاحب نے روز نامہ جنگ کے ۸ جون ۱۹۸۸ء کے شمارے میں لکھا ہے جس کا نفس مضمون یہ ہے۔ "وزیر اعظم جونیجو کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو سچ مچ کا وزیر اعظم تصور کر لیا اور کم از کم وہ اختیارات استعمال کرنے کی کوشش کی جو ترمیم زدہ آئین میں ان کو تفویض تھے۔" انہیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ وہ تو محض ایک دکھاوے کے وزیر اعظم ہیں اور اصل طاقت اور اقتدار کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ پچھلے سال جب ڈیفنس بجٹ پر احتجاج ہوا اور جونیجو صاحب نے مسخرہ پن سے عوام کی توجہ بجٹ سے ہٹانے کے لئے جرنیلوں اور سول افسروں کی بڑی کاریں واپس لے کر انہیں چھوٹی سوزوکی کاریں دینے کا اعلان کیا۔ (جس مذاق سے واقعی عوام کی توجہ بٹ کر رہ گئی) تو اس اقدام کو بھی فوج کی مخالفت پر تعبیر کیا گیا۔ یہ افواہ کہ جونیجو صاحب انٹر سروسز انٹیلی جینس کے ڈائریکٹر جنرل کو اوجڑی کیمپ کے سانحے کی پاداش میں ملازمت سے سبکدوش کرنے والے ہیں' یا چوہڑ ہڑپال کے واقعہ میں ملوث ممبر صوبائی اسمبلی کے خلاف کوئی اقدام کرنے میں تساہل کر رہے ہیں۔ ناقابل برداشت اعمال تھے۔ لیکن ان کا سب سے زیادہ گھناؤنا جرم تو جنیوا سمجھوتے کے لئے تمام سیاسی اکابرین سے مشورہ کرنا تھا اور پھر مس بینظیر بھٹو کی یہ شرط مان لینا کہ اس گول میز کانفرنس میں نہ تو صدر ضیاء الحق کا کوئی خطاب ہو اور نہ ہی وہ آنے والے مندوبین سے کوئی سوشل رابطہ قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اس کانفرنس کے اختتام پر صدر ضیاء الحق نے اخبار نویسوں کو کھانے پر بلایا تو اس کھانے اور تمام گفتگو کو وزیر اعظم کے حکم سے پریس میں بلیک آوٹ کیا گیا۔ یہ اور ایسے ہی دیگر عوامل تھے یا ہونگے جن کی وجہ سے صدر ضیاء الحق نے ۲۹ مئی جیسا اقدام کیا تاکہ ملک اور دنیا بھر کو علم ہو جائے' کہ یہاں اصل حکمران کون ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جونیجو حکومت اور تمام قومی اسمبلی نے اسی دن اپنی تقدیر آپ ہی لکھ دی تھی۔ جب انھوں نے آر۔ سی۔ او اور آٹھویں ترمیم کی توثیق کر دی تھی۔ شاید اقتدار اور اقتدار کے ہمراہ دیگر سہولتیں اتنی خوش آئند تھیں کہ یہ لوگ مزاحمت کر کے کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ انہیں جان لینا چاہیئے تھا کہ تیسری دنیا میں فوج جیسی منظم قوت کے ساتھ اقتدار میں شراکت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی تا آنکہ سول حکومت اس منظم قوت کی تابع ہو کر رہے۔

چنانچہ گو یہ بات حیران کن تو نہیں ہونی چاہیئے تھی لیکن پھر بھی جب میں نے یکم جون کا جنگ اخبار پکڑا اور پہلے ہی صفحے پر شہ سرخی دیکھی تو میرا دماغ چکرا سا گیا۔ صاحب صدر نے کچھ اس مشفقانہ انداز سے کہ جیسے کل کے لئے چھٹی کا اعلان کر رہے ہوں، فرمایا تھا کہ اگر حالات ۱۹۷۷ء جیسے ہوئے تو میں پھر ۱۹۷۷ء والے ہی اقدام کروں گا۔ ذہن شل ہو گیا اور میں بے نور نظروں سے دیر تک اخبار کی طرف تکتا رہ گیا۔ یا خدا! کیا ہم پھر اسی نقطۂ آغاز کی طرف لوٹ رہے ہیں؟

مارشل لاء کا سیاسی انداز پریس میں جاری تھی کہ 29 مئی 88ء کو صدر ضیاء الحق نے جونیجو حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ اس صورت حال کا تجزیہ بھی قارئین تک پہنچانا ضروری خیال کیا گیا۔ مصنف نے شپ پریس کے نام سے تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

Address to the Nation by General Mohammad Zia-ul-Haq C.M.L.A.

The following is the English rendering of the Address to the Nation on 5th July, 1977 by the Chief Martial Law Administrator, General Mohammad Zia-ul-Haq:

My dear countrymen

"Assalam-o-alaikum":

I deem it a singular honour to address the great nation of this great country. I am grateful to God Almighty for this. You must have learnt by now that the Government of Mr. Zulfikar Ali Bhutto has ceased to exist and an Interim Government has been established in its place. This change-over which began at about midnight last night, was completed by this morning. I am grateful to God Almighty that the process of change-over has been accomplished smoothly and peacefully. This action was carried out on my orders. During this period the former Prime Minister Zulfikar Ali Bhutto and some of his colleagues have been taken into protective custody. Likewise, all the prominent leaders of the Pakistan National Alliance except Begum Nasim Wali Khan have also been taken into custody.

The reactions to this take-over have so far been very encouraging. A stream of congratulatory messages has been pouring in from different quarters. I am grateful for this to my nation as well as to the buoyant and 'momin' armed forces of Pakistan.

It is necessary to add here that some people have expressed misgivings that the Army take-over may have been at the behest of someone. Could it be that General Zia had secretly concerted with the former Prime Minister? On this I can only say that truth can never remain unexposed. ... In fact, such an air of distrust has been created during the past few months that even well-meaning people also get bogged down in doubts and apprehensions.

You must have heard from the morning news bulletin that the armed forces of Pakistan have taken over the administration of the country. The Army take-over is never a pleasant act because the armed forces of Pakistan genuinely want that the administration of the country should remain in the hands of the representatives of the people who are its real masters. The people exercise this right through their elected representatives who are chosen in every democratic country through periodic elections.

The elections were held in our beloved homeland on 7th March last. The election results, however, were rejected by one of the contending parties. They alleged that the elections had been rigged on a large scale and demanded fresh elections. To press their demand for re-election, they launched a movement which assumed such dimensions that people even started saying that democracy was not workable in Pakistan, But I genuinely feel that the survival of this country lies in democracy and democracy alone.

It is mainly due to this belief that the armed forces resisted the temptation to take-over during the recent provocative circumstances in spite of diverse massive political pressures. The armed forces have always desired and tried for the political solution to political problems. That is why the

armed forces stressed on the then Government that they should reach a compromise with their political rivals without any loss of time. The Government needed time to hold these talks. The armed forces bought them this valuable period of time by maintaining law and order in the country.

The armed forces were subjected to criticism from certain quarters for their role in aid of the civil administration, but we tolerated this criticism in the hope that it was a passing phase. We hoped that when this climate of agitational frenzy came to an end, the nation would be able to appreciate the correct and constitutional role of the armed forces and all fears would by allayed.

I have just given you a very brief outline of the situation obtaining in the country. It must be quite clear to you now that when the political leaders failed to rescue the country out of a crisis, it is an inexcusable sin for the forces to sit as silent spectators. It is primarily for this reason that the army had to intervene to save the country.

I would like to point out here that I saw no prospects of a compromise between the People's Party and the PNA, because of their mutual distrust and lack of faith. It was feared that the failure of the PNA and PPP to reach a compromise would throw the country into chaos and the country would thus be plunged into a more serious crisis. This risk could not be taken in view of the larger interests of the country.

The Army had, therefore, to act as a result of which the Government of Mr. Bhutto has ceased to exist. Martial Law has been imposed through out the country. The National and

Provincial Assemblies have been dissolved and the Provincial Governors and Ministers have been removed.

But the Constitution has not been abrogated. Only the operation of certain parts of the Constitution has been held in abeyance. Mr. Fazal Elahi Chaudhry has very kindly consented to continue to discharge his duties as President of Pakistan as heretofore under the same Constitution. I am grateful to him for this. To assist him in the discharge of his national duties, a four-member Military Council has been formed. The Council consists of the Chairman, Joint Chiefs of Staff and Chiefs of Staff of the Army, Navy and Air-Force.

I will discharge the duties of the Chief of the Army Staff and Chief Martial Law Administrator. Martial Law Orders and instructions, as and when required, will be issued under my orders.

I met Mr. Justice Yaqub Ali, Chief Justice of Pakistan this morning. I am grateful to him for the advice and guidance on legal matters.

I want to make it absolutely clear that neither I have any political ambitions not does the Army want to be taken away from its profession of soldiering. I was obliged to step in to fill in the vacuum created by the political leaders. I have accepted this challenge as a true soldier of Islam. My sole aim is to organise free and fair elections which would be held in October this year.

Soon after the polls, power will be transferred to the elected representatives of the people. I give a

solemn assurance that I will not deviate from this schedule. During the next three months, my total attention will be concentrated on the holding of elections and I would not like to dissipate my powers and energies as Chief Martial Law Administrator on anything else.

It will not be out of place to mention here that I hold the judiciary of the country in high esteem. I will do my best to refrain from doing anything which is likely to restrict the power of the judiciary. However, under unavoidable circumstances, if and when Martial Law Orders and Martial Law Regulations are issued, they would not be challenged in any Court of Law.

I will soon announce the modalities and detailed time table for holding of elections. I hope and expect that all political parties will co-operate with me in this behalf. A good measure of tension had been created in the country during the recent political confrontation. It had therefore, become imperative to allow time to cool off emotions. I have, therefore, banned all political activities from today till further orders. Political activities, however, will be allowed before the polls.

My dear countrymen I have expressed by real feeling and intentions, without the slightest ambiguity. I have also taken you into confidence about my future plans. I seek guidance from God Almighty and help and co-operation from my countrymen to achieve this noble mission. I also hope that the judiciary, the administration and the common man will extend whole-hearted co-operation to me.

It would be my utmost endeavour to ensure that the Martial Law Administration not only treats the people in

a spirit of justice and equality but also makes them feel so. The civil administration, too, has to play an important role in this behalf. I am, therefore, pleased to announce that the Chief Justices of the Provincial High Courts have, on my request, consented to become the Acting Governors of their respective provinces.

The officers in the civil administration, who have any apprehensions about their future are hereby assured that no victimisation will take place. However, if any public servant fails in the discharge of his duties, shows partiality ~~role~~ or betrays the confidence of the nation, he will be given exemplary punishment. Similarly, if any citizen disturbs law and order in the country he will also be severely dealt with.

So far as foreign relations are concerned, I want to make it absolutely clear that I will honour all the agreements, commitments and contracts signed by the outgoing Government.

In the end, I would appeal to all the officers and men of the armed forces to discharge their duties justly and impartially. I hope they will deal with every situation without showing any undue lenience. I will also expect, them to forgive those who have ridiculed or harassed them. This will be in the true Islamic tradition. I call upon them to preserve their own honour and that of their profession in the discharge of their duties. I am sure they will acquit themselves of their new responsibility honourably. This will certainly enhance their prestige and position in the society.

I will now like to enumerate the following few points:—

(1) The Civil Courts will continue to discharge thei duties as before;

(2) The Federal Security Force will soon be reorganised;

(3) Large-scale transfers of civil servants, which have been ordered recently, will be reviewed;

(4) The organisation of the Interim Government is is as follows:—

(a) President Fazal Elahi Chaudhry will be the Head of the State;

(b) The important administrative matters will be dealt with by the Military Council mentioned earlier;

(c) The Chief Martial Law Administrator will be the Chief Executive;

(d) Secretary-General Defence, Mr. Ghulam Ishaq Khan, will coordinate the functioning of all Federal Ministries and Departments;

(e) The Federal Secretaries will continue to head their respective Departments;

(f) The Chief Justices of the Provincial High Courts will be the Acting Governors of their respective provinces;

(g) The Provincial Administration will be headed by the Provincial Martial Law Administrators and the Provincial Secretaries will continue to hold charge of their respective Departments.

(5) I sincerely desire:

(a) The civil administration to discharge its duties without any fear or apprehension;

(b) The police to develop a spirit of selfless service;

(c) The Press to live up to its claims as the advocate of "freedom of the Press" without violating the "code of conduct";

(d) The nation to develop a sense of sanity and reasonableness;

(e) The life, honour and property of every citizen to be safe;

(f) Peace and tranquility to prevail and 'goondaism' to come to an end ; and

(g) Educational institutions not to become political arenas.

(6) I want to assure you that the frontiers of Pakistan are fully guarded and the armed force are there to discharge their duties. Authorised traffic across the borders is continuing.

(7) To conclude, I must say that the spirit of Islam, demonstrated during the recent movement, was commendable. It proves that Pakistan which was created in the name of Islam, will continue to survive only if it sticks to Islam. That is why, I consider the introduction of Islamic system as an essential prerequisite for the country.

"Pakistan-Paindabad"

Revival of the Constitution

PRESIDENT'S ORDER 14 OF 1985

(Islamabad 2nd March, 1985)

5. Removal of difficulties (1) If any difficulty arises in giving effect to any of the provisions of this Order, the President may make such provisicns and pass such orders as he may deem fit.

2. The validity of any provision made, or orders passed, under clause (1) shall not be called in question in any Court.

2. After clause (6), the following new clause shall be inserted, namely:-

(7) Notwithstanding anything contained in this Article or Article 43 or any other Article of the Constitution or any other law, General Muhammad Zia-ul-Haq, in consequence of the result of the referendum held on the nineteenth day of December, 1984, shall become the President of Pakistan on the day of the first meeting of Majlis-e-Shoora (Parliament) in joint sitting summoned after the electons to the Houses of Majlis-e-Shoora(Parliament) and shall hold office for a term of five years from the day, and Article 44 and other provisions of the Constitution shall apply accordingly.

48. For this Article the following shall be substituted, namely:-

"48. President to act on advice, etc (1) In the exercise of his functions, the President shall act in accordance with the advice of the Cabinet, the Prime Minister, or appropriate Minister;

Provided that the President may require the Cabinet to reconsider or consider such advice, as the case may be, either

generally or otherwise, and the President shall act in accordance with the advice tendered after such reconsideration or consideration.

(2) Notwithstanding anything contained in clause (1), the the President shall act in his discretion in respect of any matter in respect of which he is empowered by the constitution to do so.

(3) If any question arises whether any matter is or is not a matter in respect of which the President is by the constitution empowered to act in his discretion, the decision of the President in his discretion shall be final, and the validity of anything done by the President shall not be called in question on the ground that he ought or ought not to have acted in his scretion.

(4) The question whether any, and if so what, advice was tendered to the President by the Cabinet, the Prime Minister, a minster or Minister of State shall not be inquired into in, or by, any Court tribunal or other authority.

(5) Where the President dissolves the National Assembly, he shall, in his discretion.-

(a) appoint a date, not later than one hundred days from the date of the dissolution, for the holding of a general election to the Assembly; and

(b) appoint a care-taker Cabinet.

(c) If, at any time, the President, in his discretion, or on the advice of the Prime Minister, considers that it is desirable that any matter of national importance should be referred to a referendum, the President may cause the matter to be referred to a referendum in the form of a question that is capable of being answered either by

'Yes' or 'No"

(7) An Act of Majlis-e-Shoora (Parliament) may lay down the procedure for the holding of a referendum and the compiling and consolidation of the result of a referendum."

"90. Exercise of executive authority of the Federation. The executive authority of the Federation shall vest in the President and shall be exercised by him, either directly or through officers subordinate to him, in accordancs with the Constitution.

91. The Cabinet. (1) There shall be a Cabinet of Ministers, with the Prime Minister at its head, to aid and advise the President in the exercise of his functions.

(2) The President shall in his discretion appoint from amongst the members of the National Assembly a Prime Minister who, in his opinion, is most likely to Command the confidence of the members of the National Assembly.

(3) The person appointed under clause (2) shall, before cntering upon the office, make before the President oath in the form set out in the Third Schedule.

(4) The Cabinet, together with the Ministers of State, shall be collectively responsible to the National Assembly.

(5) The Prime Minister shall hold office during the pleasure of the President, but the President shall not excreise his powers under this clause unless he is satisfied that the Prime Minister does not command the confidence of the majority of the National Assembly.

(6) The Prime Minister may, by writing under his hand addressed to the President, resign his office.

(7) A Minister who for any period of six consecutive months is not a member of the National Assembly shall, at the

expiration of that period, cease to be a Minister and shall not before the dissolution of that Assembly be again appointed a Minster unless he is elected a member of that Assembly.

Provided that nothing contained in this clause shall apply to a Minister who is a member of the Senate.

(8) Nothing contained in this Article shall be construed as disqualifying the Prime Minister or any other Minister or a Minister of State for continuing in office during any peroid during which the National Assembly stands dissolved, or as preventing the appointment of any person as Prime Minister or other Minister or as Minister of State during any such Period.

99. Conduct of business of Federal Government.-(1) All executive actions of the Federal Government shall be expressed to be taken in the name of the President.

(2) The President shall by rules specify the manner in which orders and other instruments made and executed in his name shall be authenticated, and the validity of any order or instrument so authenticated shall not be questioned in any Court on the ground that it was not made or executed by the President.

(3) The President that also make rules for the allocation and transaction of the business of the Federal Government.

152. (A).- National Security Council.-(1) There shall be a National Security Council to make recomendations relating to the issue of a Proclamation of Emergency under Article 232, Security of Pakistan and any other matters of national importance that may be referred to it by the President in consultation with the Prime Minister.

(2) The National Security Council shall consist of the President, the Prime Minister, the Chairman of the Senate, the Chairman, Joint Chiefs of Staff Committee, the Chiefs of the Pakistan Army, the Pakistan Navy and the Pakistan Air Force and the Chief Ministers of the Provinces.

Provisional Constitution Order

(24th March, 1981) (1 OF 1981)

14. Political parties.-(1) When political activity is permitted by the President, only such of the defunct political parties shall be entitled to function as were registered with the Election Commission, or were declared by the Commission to be eligible to participate in elections, by the eleventh day of October, 1979.

(2) All political parties other than those referred to in clause (1) shall stand dissolved and all their properties and funds shall be forfeited to the Federal Government.

(3) No political party shall be formed after the commencement of this Order except with the previous permission in writing of the Chief Election Commissioner.

(4) If the President is satisfied that a political party has been formed or is operating in a manner prejudicial to the Islamic Ideology or the sovereignty, integrity or security of Pakistan, the President may dissolve the political party in consultation with the Chief Election Commissioner.

15. Validation of Laws, acts, etc.-(1) The Proclamation of the fifth day of July, 1977, all President's Orders, or orders of Chief Martial Law Administrator, including Orders amending the Constitut-

ion made by the President or the Chief Martial Law Administrator, Martial Law Regulations, Martial Law Orders and all other laws, made on or after the fifth day of July, 1977, are hereby declared, notwithstanding any judgment of any Court, to have been validly made by competent authority and shall not be called in question in any Court on any ground whatsoever (and shall continue in force until altered, repealed, reconstituted or amonded by the competent authority).

(2) All orders made, proceedings taken and acts done by any authority, or by any person, which were made, taken or done, or purported to have been made, taken or done, on or after the fifth day of July, 1977, in exercise of the powers derived from any President's Orders, Orders of the Chief Martial Law Administrator, Martial Law Regulations, Martial Law Orders, ennctments, notifications, rules, orders or bye-laws, or in execution of any orders made or sentences passed by any authoriry in the exercise or purported exercise of powers as aforesaid, shall notwithstanding any judgment of any Court, be deemed to be and always to have been validly made, taken or done and shall not be called in question in any Court at on any ground whatsoever:

Provided that no thing in this clause shall apply to transactions past and closed.

(3) Where a Military Court is established in pursuance of a Martial Law Order made by the Chief Martial Law Administrator, no other Court, including the Supreme Court and a High Court, shall grant an injunction, make any order or entertain any proceedings in respect of any matter of which cognizance has been taken by, or which has been transferred to, the Military Court, and all proceedings in respect of any such matter which may be pending before such other Court shall abate.

(4) No suit or other legal proceedings shall lie in any Court against any authority or any person for or on account of

or in respect of any order made, proceedings taken or act done whether in the exercise or purported exercise of the powers referred to in clause (2) or in execution of or in compliance with orders made or sentences passed in exercise or purported exercise of such powers.

(5) Notwithstanding any judgment of any Court, including any judgment in respect of the powers of Courts relating to judicial review, any Court, including the Supreme Courts and a High Court, shall not,-

(a) make an order relating to the validity or effect of any Order or Martial Law Regulation made by the Chief Martial Law Administrator or any Martial Law Administrator or of anything done, or action taken, or intended to be done or taken, thereunder;

(b) make an order relating to the validity or effect of any judgment or sentence passed by a Military Court or Tribunal;

(c) grant an injunction, make any order or entertain any proceedings in respect of any matter to which the jurisdiction of a Military Court or Tribunal extends and of which cognizance has been taken by a Military Court or Tribunal; or

(d) issue any process against the Chief Martial Law Administrator or a Martial Law Administrator or any person acting under the authority of either.

(6) Every such order, injunction or process as is referred to in clause (5) made, granted or issued at any time before or after the commencing day shall, notwithstanding any judgment of any Court, be null and void and of no effect whatsoever and any proceedings for the making, granting or issue of such of such order, injunction or process which may be pending before any Court, including the Supreme Court and a High Court, shall abate; and it is hereby declared that any

such order, injunction or process shall not be binding on any Martial Law Authority or civil authority acting under the directions of a Martial Law Authority.

16. Power to amend Constitution.- The President as well as the Chief Martial Law Administrator shall have, and shall be deemed always to have had, the power to amend the Constitution.

17. Oath of office of Judges.—(1) A person holding office immediately before the commencement of this Order as Chief Justice of Pakistan or other Judge of the Supreme Court, or Chief Justice or other Judge of a High Court, or Chairman or member of the Federal Shariat Court, shall not continue to hold that office if he is not given, or does not make, oath in the form set out in the Schedule before the expiration of such time from such commencement as the President may determine or within such further time as may be allowed by the President.

(2) A person referred to in clause (1) who has made oath as required by that clause shall by bound by the provisions of this Order and, notwithstanding the judgment of any Court, shall not call in question or permit to be called in question the validity of any of the said provisions.

(3) A Judge of the Supreme Court and the Chairman and a member of the Federal Shariat Court shall make the oath before the President or a person nominated by him and a Judge of a High Court shall make the eath befóre the Governor or a person nominated by him.

18. Removal of difficulties.— The Chief Martial Law Administrator may, for the purpose of removing any difficulties or for bringing the provisions of this Order into effective operation, make such provisions as he may deem to be necessary or expedient.